

بانگ درا

علامہ اقبال

۱۳۷۵





فانگی دورا

عالمی ادبیات

ادبیات
فارسی

۷

۱

۲۵

کتابخانه تحفہ
تاریخ ہندوستان

بانگ درا

اسکن شد

علامہ اقبال

(پتہ)
ناز پبلشنگ ہاؤس پھاڑی بھوجلہ، دلی

طبع اول ۵۰۰

قیمت ۸۰۰

طابع کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی

ناشر پردیز بک ڈپو دہلی

ملنے کا پتہ

نازی پبلشنگ ہاؤس پہاڑی بھوجلہ دہلی

حیاتِ اقبال

حضرت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی

ڈاکٹر اقبال کے آباداجلا دشیر سے آکر سیالکوٹ میں آباد
اقبال کا خاندان ہو گئے تھے جو سپر گون کے برہمن آج سے ڈھائی سو سال
پہلے مسلمان ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر محمد اقبال اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ڈاکٹر اقبال
کے والد شیخ نور محمد بڑے نیک اور اللہ والے بزرگ تھے۔ سیالکوٹ میں ان کا چھوٹا سا
کاروبار تھا۔ وہ سارے شہر میں اپنی نیکی اور پرہیزگاری کی وجہ سے ہر دلعزیز تھے۔

ان کے دو بیٹے تھے۔ عطا محمد اور اقبال محمد یہی اقبال ہیں جو آگے
معلیم و تربیت چل کر ایشیا کے سب سے بڑے شاعر بن گئے۔ اقبال ۱۸۷۳ء
میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ شیخ نور محمد نے اپنے بچوں کو اردو، فارسی اور انگریزی تعلیم
دلائی۔ شیخ عطا محمد جو اپنے چھوٹے بھائی سے ۴ برس بڑے تھے انجینئر بن گئے اور
اقبال مشن اسکول پاکر کالج میں داخل ہو گئے۔

شیخ نور محمد کے استادوں میں مولوی میر حسن نامی ایک بڑے عالم تھے جو مشن
اسکول میں عربی پڑھایا کرتے تھے۔ ان کے پڑھانے میں ایک خاص بات یہ تھی کہ جو کچھ
بتا دیتے تھے وہ بات دلوں میں نقش ہو جایا کرتی تھی۔

اقبال ابھی اسکول میں پڑھتے ہی تھے کہ ان کی طبیعت
شاعری کا ذوق و شوق کے اصلی جوہر چمکنے لگے اور انھوں نے شاعری کی طرف

توجہ کی مولانا روم کے اشعار اقبال کو نہایت پسند تھے۔ آپ نے اس زمانے میں اپنا کلام حضرت داغ کو بغرض اصلاح بھیجنا شروع کر دیا۔ حضرت داغ ڈاک کے ذریعہ آپ کے کلام کی اصلاح کر کے ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

سیالکوٹ سے لاہور پرائمری، مڈل اور انٹرنس کے امتحانوں میں آپ نے کامیابی حاصل کی بلکہ وظائف بھی ملنے لگے۔ جب سیالکوٹ میں کالج بن گیا تو اس میں داخل ہو گئے۔ مولوی میر حسن سے عربی اور فارسی پڑھتے تھے۔ محنت کر کے آپ نے عربی اور فارسی میں خاصی لیاقت پیدا کر لی۔ سیالکوٹ میں ایف اے کا امتحان پاس کر کے سلسلہ تعلیم کو جاری رکھنے کے لیے لاہور پہنچے اور گورنمنٹ کالج میں داخل ہو گئے۔ اس کالج میں آرنلڈ نامی ایک لائق و فائق اور ہمدرد پروفیسر تھے جو اقبال سے بڑی محنت اور شفقت سے پیش آیا کرتے تھے۔

لاہور میں مشاعرے بھی ہوتے تھے جن میں اس زمانے کے مشہور شعرا اپنا کلام سناتے تھے۔ اقبال بھی ان محفلوں میں جانے اور اپنا کلام سنانے لگے۔ آہستہ آہستہ سب کی نظریں ان پر پڑنے لگیں۔ ان کی عمر ۲۳ سال تھی کہ لاہور کے ایک مشاعرہ میں انھوں نے ایک غزل پڑھی۔ اس مشاعرہ میں مرزا ارشد گورگانی بھی تھے جو ان دنوں چوٹی کے شاعروں میں گنے جاتے تھے۔ جب اقبال نے یہ شعر پڑھا

مولیٰ سمجھ کے شان کریں نے چن لئے

قطرے جو تھے میرے عرق انفعال کے

تو مرزا ارشد تڑپ اٹھے اور کہنے لگے۔ میاں صاحبزادے! سبحان اللہ! اس عمر

میں یہ شعر!

آپ کے کلام کی مقبولیت اقبال بی۔ اے میں کامیاب ہوئے عربی اور انگریزی میں اول آنے پر انہیں سونے کے دمنے

بھی ملے۔ بی۔ اے کے بعد آپ نے ایم اے کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور ایک سونے کا تمغہ انعام میں ملا۔ آپ پہلے اونیورسٹی کالج اور بعد میں گورنمنٹ کالج میں فلاسفی کے پروفیسر مقرر ہوئے جس زمانہ میں وہ کالج میں پڑھتے تھے ان کی شاعری کی دھوم مچ گئی تھی ۱۸۹۹ء میں انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں آپ نے ”نالیہ تمیم“ کے نام سے ایک درد انگیز نظم پڑھی جس سے سننے والوں کے دل بے چین ہو گئے اور حاضرین کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ پھر آپ نے ہمالہ۔ ہندوستان ہمالہ وغیرہ قومی نظمیں لکھیں جو ہندستان بھر میں پسند کی گئیں۔

ان دنوں لاہور سے شیخ عبدالقادر مخزن نامی ایک ماہانہ رسالہ شائع کرتے تھے سب سے پہلے اقبال کے اشعار اس رسالہ میں شائع ہونے لگے اقبال اور شیخ عبدالقادر میں بڑا میل جول تھا۔

آپ کا روزانہ پروگرام ان دنوں ان کا طریقہ یہ تھا کہ صبح اٹھ کر نماز اور نماز کے بعد اونچی آواز سے قرآن شریف پڑھتے پھر ورزش کرتے۔ کالج کا وقت ہو جاتا تھا۔ وہ کچھ کھائے پئے بغیر ہی کالج چلے جاتے تھے اور دوپہر کو آکر کھانا کھاتے تھے۔ عام طور پر وہ کھانا صرف ایک وقت کھاتے تھے۔ صبح کو چائے بھی نہ پیتے تھے۔ ہاں لٹ کو کبھی کبھی نمکین پائے پی لیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ پورے دو مہینے رات کھا کھ کھ کر تہجد کی نماز پڑھتے رہے۔

سفر لہور پر اس زمانہ میں پروفیسر آرنلڈ اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو کر دلالت

چلے گئے۔ ۱۹۰۵ء میں اقبال بھی یورپ روانہ ہو گئے۔

اقبال انگلستان پہنچ کر کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہو گئے اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ کیمبرج میں فلسفہ کا امتحان پاس کر کے آپ نے ایران کے فلسفہ کے متعلق ایک کتاب لکھی جس پر جرمنی کے میونخ یونیورسٹی نے آپ کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی جرمنی سے واپس آ کر آپ نے لندن میں یسٹری کا امتحان پاس کیا۔ ان دنوں پروفیسر آرنلڈ لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ جب وہ رخصت ہو گئے تو اقبال چھ ماہ تک ان کی جگہ عربی پڑھاتے رہے۔

اقبال نے یورپ پہنچ کر ایک ایسی دنیا دیکھی جو ان کے لیے بالکل نئی تھی۔ یورپ والوں کی تہذیب میں ان کو خوبیاں بھی نظر آئیں اور برائیاں بھی۔ ان کی ظاہری بھرپور توائفوں کو چکا چوند کر دیتی تھی مگر جب شاعر نے ٹھٹھولا تو اندر سے کھوکھلا پایا۔ ان کے دل پر بڑی چوٹ لگی کہ اگر سب انسان ایک ہی کنبہ کے لوگ ہیں تو پھر ان میں اتنا فرق کیوں ہے۔ یہ لوٹ کھسوٹ کتنا تک جاری رہے گی۔ اور کیا انسان کی زندگی کا مقصد یہی ہونا چاہیے جو یورپ کی قوموں کے سامنے ہے۔

دہلیت سے واپس آ کر انھوں نے اردو میں بہت سی نظمیں **ہندوستان کی واپسی** لکھیں۔ لیکن اب فارسی کی طرف ان کی توجہ ہو گئی تھی۔ کچھ عرصہ تک انھوں نے اردو میں شعر کہنا ہی چھوڑ دیا تھا لیکن زندگی کے آخری سالوں میں پھر کہیں اردو کی طرف توجہ کی۔ اردو کو چھوڑ کر فارسی میں شعر کہنے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو فارسی زبان شاعری کے لیے بہت موزوں ہے اور دوسرے اب اقبال کی شاعری کا رنگ بدل گیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ صرف ہندوستان کے لیے نہیں بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کیلئے

شعر کہتا ہوں اور فارسی کے سوائے کوئی زبان ایسی نہیں جس کے ذریعے اپنے خیالات دوسرے ممالک کے مسلمانوں تک پہنچائے جاسکتے ہوں۔

اقبال ۱۹۰۸ء میں ولایت سے ہندستان واپس آئے اور گورنمنٹ کالج میں پڑھانے لگے جہاں سے آپ کو پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ آپ کو دکالت کرنے کی بھی اجازت تھی۔

ڈاکٹر اقبال کو یورپ سے آئے دو ڈھائی سال ہوئے

جنگ طرابلس و بلقان

تھے کہ اطالیہ نے ترکی سے طرابلس چھین لیا۔ یزخم ابھی تازہ تھا کہ بلقان کی عیسائی ریاستوں نے جو مدت سے ترکی کے ماتحت تھیں بغاوت کر دی۔ اقبال کی طبیعت پر ان واقعات کا اثر بہت پڑا۔ چنانچہ انھوں نے اس زمانہ میں ”شکوہ“ لکھا جو ان کی نظموں میں بہت مشہور ہے کہ پہلے پہل اقبال نے اس نظم کو انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ میں پڑھا تو ان کی در دیں ڈوبی ہوئی آواز سامعین کے دلوں میں اس طرح نشر گھنگھو لنے لگی کہ آہوں اور سسکیوں کے سوا سارے جلسے میں کچھ اور نہ سنائی دیتا تھا، اقبال نے بہت سی اچھی نظمیں لکھی ہیں لیکن شکوہ سے زیادہ ان کی کوئی اور نظم مقبول نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر اقبال نے ڈھائی سال کی ملازمت کے بعد

ملازمت سے استعفا

دیکھا کہ استعفا دے دیا۔ کیونکہ وہ اپنے خیالات آزادی سے ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ اب آپ نے برطانیہ کی طرف توجہ زیادہ کی۔ لیکن دولت کمانے کا ان کو زیادہ شوق نہیں تھا۔ اس لیے صرف اتنے ہی مقدمے لیتے تھے جن کی آمدنی سے ان کا خرچ پورا ہو جاتا۔

فلسفہ خودی

۱۹۱۳ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی۔ ان دنوں اقبال کے دل میں ایسے خیالات موجزن تھے جنہیں اردو میں پوری طرح ظاہر کرنا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے آپ فارسی میں شعر کہنے لگے۔ فارسی میں انھوں نے جو باتیں کہی ہیں وہ اس لحاظ سے بالکل نئی ہیں کہ یورپ یا ایشیا کے کسی شاعر نے انہیں چھوا تک نہیں۔ فارسی میں آپ نے "اسرار خودی"، لکھ کر حضرت انسان کی پوزیشن اور ان کے معیار کو بلند و بالا تر بنا دیا۔ اگلے زمانے کے بہت سے شاعروں نے یہی سمجھ رکھا تھا کہ انسان کو اپنی خودی بالکل مٹا دینی چاہیے۔ اس قسم کے خیالات سب سے پہلے یونان میں پیدا ہوئے اور جب مسلمانوں نے یونانی کتب کا عربی زبان میں ترجمہ کیا تو یہ باتیں مسلمانوں میں پیدا ہو گئیں۔ ان کا خیال تھا کہ انسان کو ہاتھ پاؤں ملانے کی ضرورت نہیں بلکہ اسے صرف خدا پر بھروسہ کر کے گوشہ گیری اختیار کرنی چاہیے۔ اگر کوئی شخص زندگی پانا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ اپنے آپ کو فنا کر ڈالے۔ اس قسم کے خیالات نے مسلمانوں کو کابل اور بے عمل بنا دیا تھا۔ اقبال نے اسرار خودی میں اس قسم کے خیالات کی سخت مخالفت کی۔ اقبال کے اشعار قرآن شریف کی سچی تعلیم کے علمبردار ہیں وہ کہتے ہیں کہ اپنے آپ کو پہچانو۔ دنیا میں جو کچھ ہے وہ سب کچھ تمہارے لیے ہے۔ دل سے ڈرو اور خوف بالکل نکال دو۔ دریاؤں میں گود پڑو لہروں سے لڑو۔ چٹانوں سے ٹکرا جاؤ۔ کیونکہ زندگی بچھو لوں کی سیج نہیں، میدان جنگ ہے۔

۱۹۲۶ء میں وہ لاہور کے حلقہ سے کونسل سفر مدراس، میسور اور جیدر آباد کی ممبری کے لیے کھڑے ہو کر کامیاب ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں انھیں مدراس سے لیکچرار بننے کا بلاوا آیا۔ وہاں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ مدراس سے وہ میسور اور میسور سے جیدر آباد تشریف لے گئے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں لوگوں نے بڑی دھوم دھام سے آپ کا خیر مقدم کیا۔ ۱۹۳۰ء
میں مسلمانوں کی پرائی انجمن مسلم لیگ نے الہ آباد میں اپنا سالانہ جلسہ کیا۔ ڈاکٹر اقبال اس
جلسہ کے صدر چنے گئے۔ اس موقع پر آپ نے جو تقریر کی اس میں پاکستان کی تشکیل کے
متعلق اشارے کئے گئے تھے۔

اقبال کا مسکن ڈاکٹر اقبال کچھ عرصہ بھائی دروازہ لاہور میں رہے پھر وہاں
سے انارکلی چلے آئے۔ وہاں کوئی نو دس سال رہے۔ انارکلی سے میکلوڈ روڈ پر ایک کوٹھی میں کوئی چودہ سال گزار دیئے۔ انتقال سے کوئی
تین سال پہلے انھوں نے میورڈ روڈ پر اپنی خاص کوٹھی بنائی تھی جس کا نام جاوید منزل
رکھا گیا۔

خطابات کی بھرمار جب وہ لاہور تشریف لائے تھے۔ صرف شیخ محمد اقبال
تھے۔ ولایت سے واپس آئے تو ڈاکٹر اقبال کہلانے
لگے۔ حکومت ہند نے ان کو سر کا خطاب خطا کیا تو آپ نے اسناد مولوی حسن کو
شمس العلماء کا خطاب دلویا۔ لیکن قوم میں خود علامہ اقبال کے نام سے موسوم ہو گئے
بادیحد ان تمام خطابات وغیرہ کے وہ ایک سیدھے سادے درویش تھے۔ انھوں نے
خود اپنے آپ کو اکثر شعروں میں فقیر اور درویش کہا ہے اور اس پر فخر بھی کیا ہے۔
اللہ کے بندوں کو آتی نہیں رو باہی

اقبال کو دنیا داری کے ڈھنگ نہیں آتے تھے۔ جو بات دل میں ہوتی تھی بلا جھجک
صاف صاف کہہ دیتے تھے۔ خواہ کسی شخص کی کیسی ہی بڑی پوزیشن کیوں نہ ہو، ایک
دفعہ دہلی میں وائسرائے سے ملاقات ہوئی۔ وائسرائے نے آپ کو دوسرے دن ڈنر

کی دعوت دی۔ لیکن آپ نے اپنی مصروفیت کی بنا پر دوسرے دن دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے دوسرے دن نے مجبور ہو کر اسی دن ان کی دعوت کا انتظام کر دیا۔

اب فلاں کے لباس کا حال بھی سن لیجیے۔ ابتدا میں وہ آپ کا لباس

شلواری اور کرتہ پہنتے تھے۔ سر پر سفید بگڑی ہوتی تھی۔ ولایت جا کر انہیں انگریزی لباس بھی پہننا پڑا۔ لیکن وہ ولایت سے آنے کے بعد عام طور پر شلواری قمیض اور خرقہ کوٹ کے ساتھ ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ کبھی کبھی پتلون پہن لیتے تھے تو اس کے ساتھ ہیڈ کی جگہ ترکی ٹوپی ہوتی تھی۔ وہ انگریزی لباس کو پسند نہیں کرتے تھے اور کچا کرتے تھے۔ مجھے پتلون کی بہ نسبت شلواری زیادہ پسند ہے۔

علامہ اقبال نے مدت سے کلام کہنا چھوڑ دیا تھا۔ آخری زمانہ کا کلام

زندگی کے آخری زمانہ میں انھوں نے اردو کی طرف توجہ کی۔ بال جبریل علامہ اقبال کی کتابوں میں سب سے اونچا درجہ رکھتی ہے۔ اقبال نے اپنی اور کتابوں میں صرف مسلمانوں سے خطاب کیا ہے۔ جاوید نامہ اور بال جبریل میں انھوں نے ساری دنیا کے خیر خواہوں کو پیغام دیا ہے۔ مذکورہ بالا دونوں کتابوں کو غور سے پڑھو تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین کو خدا کی ملکیت سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ سارے انسان ایک کنبہ کے لوگوں کی طرف مل جل کر رہیں۔ زمین کی خاطر ایک دوسرے سے لڑیں جھگڑیں نہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو کچھ عرصہ سے درگاہ کا مرض تھا۔ ہرچہ تھے ناسازی طبع

پانچویں سال اس درمے کے دوسرے پڑتے تھے۔ ۱۹۳۴ء

میں عید کی نماز پڑھ کر آئے اور گرم دودھ ڈال کر سویاں کھائیں سوئیاں کھاتے ہی ان کی آواز بیٹھ گئی بہتیرا علاج کیا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ جس کی وجہ سے ہائیکورٹ کا جانا بند کر دیا۔ نواب بھوپال نے آپ کی مافی مشکلات کے مد نظر آپ کے نام پانچسور وپیہ ماہوار کا وظیفہ جاری کر دیا جو دفات تک ان کو برابر ملتا رہا۔

جنوری ۱۹۳۸ء کو یعنی ان کی وفات سے سوا چار مہینے پہلے ہندستان میں جگہ جگہ یوم اقبال بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ اس موقع پر لوگوں نے علامہ اقبال سے جس قدر محبت اور عقیدت ظاہر کی۔ اسے دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ کسی شاعر کی زندگی میں ایسی قدر نہیں ہوئی ہوگی۔

یوم اقبال

۱۹۳۵ء میں ان کی بیگم صاحبہ کا انتقال ہوا۔ اس واقعہ نے ان کے دل پر بہت اثر کیا۔ چنانچہ ایک دن اکیلے بیٹھ کر وصیت لکھی اور جیڑار کے پاس بھیج دی۔ وفات سے کوئی سال بھر پہلے ان کی آنکھوں میں مونیاتر آیا۔ کچھ دنوں بعد سانس بھی پھولنے لگا۔ آپ کو معلوم ہو چکا تھا کہ عنقریب وصال حق نصیب ہونے والا ہے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۳۷ء میں علامہ نے یہ رباعی کہی تھی۔ جوشدید بیماری کے موقع پر آپ کی زبان پر تھی۔

سرور در فتنہ باز آید کہ ناید فیض از حجاز آید کہ ناید

سر آمد روزگار این فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید

۱۹۳۷ء میں طبیعت زیادہ بگڑنے لگی۔ قلب بہت کمزور ہو گیا تھا۔ دلی کے

مشہور طبیب نابینا صاحب اور حکیم محمد حسن قریشی پرنسپل طبیبہ کالج علاج کرتے تھے۔

آپ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے آپ کی بگڑی ہوئی حالت کو دیکھ کر دربار

کلمات تسلی کے کہے مگر علامہ اقبال کہنے لگے کہ بھائی میں مسلمان ہوں۔ موت سے نہیں ڈرتا۔
بھرا آپ نے یہ شعر پڑھا۔

نشان مرد مومن بانو گویم !

چوں مرگ آید تبسم بربلب ادست

وفات سے تین چار روز پہلے بلغم میں خون آنے لگا۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ دل کی

طرف جانے والی رگ کے پھٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ آخر کار علامہ نے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء

کو انتقال کیا۔ وفات کے ۱۰۰ آگے ۶۵ سال سے ادب پر تھی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ

جس کی آوازوں سے لذت گیر اب تک گوش ہے

وہ جس کی اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے

اقبال کی وفات کی خبر آنا نانا لاہور میں پھیل گئی

ہندوستان میں اقبال کا ماتم بازار بند ہو گئے اور لوگ جاوید منزل کی طرف

جانے لگے۔ شام کو جنازہ اٹھا اور شاہی مسجد کے میناروں کے سایہ میں ان کی میت کو

دفن کیا گیا۔ جنازے کے ساتھ کوئی ۵ ہزار سے زیادہ آدمی تھے آپ کے انتقال پر

ہندوستان بھر کے شہروں اور قصبوں میں جگہ جگہ ماتمی جلسے ہوئے شعرا نے اس موقع پر

مرثیے اور تاریخیں کہیں۔

چنانچہ ڈاکٹر محمد اقبال بزد۔ اور آہ مفکر اعظم سے ان کی وفات کی ہجری تاریخ

۱۳۵۷ھ نکلتی ہے اور پیغمبری دین خودی سے ۱۹۳۸ء کے اعداد نکلتے ہیں۔ علامہ

اقبال کے ایک شعر یعنی صدق اخلاقی دفا باقی نماد سے بھی ۱۳۵۷ھ کے اعداد

برآمد ہوتے ہیں۔ خواجہ دلی محمد صاحب نے ہجری اور عیسوی تاریخیں بڑی خوبی سے

نکالی ہیں اور انھیں یوں نظم کیا ہے۔
 شمع خاموش سال ہجری ہے

۱۳۵۷ھ

شمع شاعری فانوس

عیسوی ۱۹۳۸ء

ساز خاموش ہو گیا۔ مگر نغے زندہ ہیں۔ یہ صبح ہے کہ اقبال امید کے گیسوؤں سے سوئے ہوئے دلوں کو جگانے والا۔ مایوسیوں کی ہمت بندھانے والا اقبال۔ اسلام کا سچا عاشق اور ملت کا سوگوار اقبال ہم میں نہیں رہا۔ لیکن اس نے ہمارے دلوں کو یقین عمل اور تنظیم کے جس نور سے جگہ لگایا تھا۔ اس کی روشنی شکا اور مایوسی کی تاریکی میں ہمیں صراطِ مستقیم کو دکھاتی رہے گی۔ ساز خاموش ہو گیا مگر کُہ ارض اور اس کی فضا اس کے نغموں سے قیامت تک گونجتی رہے گی۔ ہمیں چاہیے کہ علامہ اقبال کے کلام کو ہر در پر میں سمجھیں اور اولوالعزمی کے ساتھ مستقل طور پر عمل پیرا ہوں۔

پانگہ

حصہ اول

..... سے ۱۹۰۵ء تک

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حصہ اول ہمالہ

لے ہمالہ بے فصیل کشور ہندوستان! چونتہ ہے تیری بیشانی کو جھک کر آسماں
تجہ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ رندی کے نشان تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے

استحسانِ دیدہ ظاہر میں کوہِ ستاں ہے تو پاسباں اپنلے تو، دیوارِ ہندوستان ہے تو
مطلعِ اولِ فلک جس کا ہو، وہ دیواں ہے تو سوئے خلوتِ گاہِ دل دامنِ کشِ انساں ہے تو

برف نے باندھ ہی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر

خندہ زن ہے جو نگارِ مہرِ عالمِ تاب پر

تیری عمرِ رفتہ کی اک آن ہے غمِ کہن دادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن
چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرم سخن تو زمیں پرادر پہنلے فلک تیرا دطن

چشمہ دامنِ ترا آئینہ سیال ہے

دامنِ موجِ ہوا جس کے لیے ردال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہا رہا کے واسطے تازیانہ دے دیا برقی سرگھسار نے
اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو کبھی جسے دست قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے

ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جانا ہے ابر

فیلِ بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

جنبشِ موجِ نسیم صبح گھوڑا رہ بنی جھومتی ہے نشہ ہستی میں ہر گل کی کلی
یوں زبانِ برگ سے گویا ہے اسکی خاموشی دستِ گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی

کہہ رہی ہے میری خاموشی ہے افسانہ مرا

کنجِ خلوت خانہ قدرت ہے کا شانہ مرا

آتی ہے ندیِ فراز کوہ سے گاتی ہوئی کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی

آئینہ سا شاہِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیر طاقی جا اس عراقِ دل نشیں کے ساز کو

اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو

بیلی شب کھولتی ہے آکے جب زلفِ رسا دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا

وہ خموشیِ شام کی جس پر تکلم ہو فدا وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق گھسار پر

خوشنما لگتا ہے یہ غارِ ترے رخسار پر

اے ہمالہ! داستانِ اس وقت کی کوئی سنا مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامنِ تما

کچھ بنا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجر داغ جس پر غارِ رنگِ تکلف کا نہ تھا

ہاں دو کھادے اے تصویرِ پھر وہ صبح و شام تو

دو ٹرچھپے کی طرف اے گردشِ ایام تو

گل رنگیں

تو شناسائے خراشِ عقدہ مشکل نہیں اے گل رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
زیب محفل ہے شریکِ شورشِ محفل نہیں یہ فراغتِ بزمِ ہستی میں مجھے حاصل نہیں

اس چین میں میں سراپا سوز سازِ آرزو

اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو

تو ٹرینا شاخ سے تجھ کو مرا آئیں نہیں یہ نظیرِ ازنگاہِ چشمِ صورت ہیں نہیں
آہ! یہ دستِ جفا جئے گل رنگیں نہیں کس طرح تجھ کو یہ سمجھاؤں کہ میں گلچیں نہیں

کام مجھ کو دیدہ حکمت کے الجھپٹوں سے کیا

دیدہ بلب سے میں کرتا ہوں نظارہ ترا

سوزِ بانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے رازِ وہ کیا ہے تم سے سینے میں جو مستور ہے

میری صورت کبھی تو اک برگِ ریاضِ طور ہے میں چین سے دو رہوں تو کبھی چین سے دو رہے

مطمئن ہے تو، پریشاں مثلِ بورتا ہوں میں

زخمی شمشیرِ زوقِ جستجو رہتا ہوں میں

یہ پریشانی مری سامانِ جمعیت نہ ہو یہ جگہ سوزی چراغِ خانہٴ حکمت نہ ہو

ناتوانی ہی مری سرمایہٴ قوت نہ ہو رشکِ جامِ جم مرا آئینہٴ حیرت نہ ہو

یہ تلاشِ متصل شمعِ جہاںِ فردز ہے

تو سن ادراکِ انساں کو خرامِ آموز ہے

عہد طفلی

تھے دیارِ نورِ زمین و آسمان میرے لیے وسعتِ آغوشِ مادرِ اک جہاں میرے لیے
تھی ہر اک جنبش نشانِ لطفِ جاں میرے لیے حرفِ بے مطلب تھی خود میری زباں میرے لیے
عہدِ طفلی میں اگر کوئی رُلاتا تھا مجھے!

شورشِ زنجیرِ در میں لطفِ آتا تھا مجھے

نکتے رہتا ہائے ادہ پہرہوںِ تلکِ سوئے قمر وہ پھٹے بادل میں بے آوازِ پاس کا سفر
پوچھنا رہ رہ کے اس کے کوہِ دھوا کی خبر اور وہ حیرتِ دروغِ مصلحتِ آمیز پر

آنکھ وقفِ دید تھی لبِ مائلِ گفتار تھا

دل نہ تھا میرا سراپا ذوقِ استفسار تھا

مرزا غالب

فکرِ انسان پر تیری ہستی سے یہ روشن ہوا ہے پرِ مرغِ نخیل کی رسائیِ تاکِ جا

تھا سراپاِ روح تو، بزمِ سخنِ پیکرِ ترا زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے

بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

مخملِ ہستی تیری بر بطن سے ہے سراپہ دار جس طرح ندی کے نفوس سے سکوت کو ہمار

تیرے فردوسِ نخیل سے ہے قدرت کی بہار تیری کشتِ فکر سے اگتے ہیں عالمِ سبزہ زار

زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تاجرِ میر میں

تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

نطق کو سونا زہیں تیرے لب اعجاز پر محو حیرت ہے ثریا رفعت پر داز پر
شاہد مضمون تصدیق ہے ترے انداز پر خندہ زن ہے غنچہ دلی گل شیراز پر

آہ! تو اُجڑی ہوئی دلی میں آرا میدہ ہے

گلشنِ دبیر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسرِ ممکن نہیں ہونچیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشین

ہائے! اب کیا ہو گئی ہندوستان کی سرزمین! آہ! اے نظارہ آمیز نگاہِ نکتہ میں!

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے

شمعِ یہ سودائی دل سوزی پر دانہ ہے

اے جہان آباد اے گہوارہ علم و ہنر ہیں سراپا نالہ خاموش تیرے بامِ ددر

ذرے ذرے میں تمہے خوابیدہ ہیں شمسِ دفر یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گھر

دفنِ تجھ میں کوئی خُزر روزگار ایسا بھی ہے؟

تجھ میں پنہاں کوئی موتی آباد ایسا بھی ہے؟

ابیر کے ہزار

ہے بلندی سے فلک بوس نشین میرا ابیر کو ہزار ہوں گلِ پاش ہے دامن میرا

کبھی صحرا کبھی گلزار ہے مسکن میرا شہرِ دیر انداز، بحرِ مرا، بن میرا

کسی دادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو

سبزِ کوہ ہے تحمل کا بچھو نا مجھ کو

اے جرمنی کا مشہور شاعر گوٹے اس جگہ مدفون ہے۔

مجھ کو قدرت نے سکھایا ہے درخشاں ہونا نافہ شاہد رحمت کا قدی خواں ہونا
 غم زدائے دل افسردہ دہنقاں ہونا رونقِ بزمِ جوانانِ گلستان ہونا
 بن کے گیسوِ رخِ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں

نشانی موجِ صرصر سے سنور جاتا ہوں
 دور سے دیدہ امید کو ترساتا ہوں کسی بستی سے جو خاموش گزر جاتا ہوں
 سیر کرتا ہوں جس دم لبِ جو آتا ہوں بالیاں نہر کو گرداب کی پہناتا ہوں
 سبزہ مزرعِ نوخیز کو امید ہوں میں

زادہ بھر ہوں، پروردہ خورشید ہوں میں
 چشمہ کوہِ کودی شورشِ قلزم میں نے اور پرندوں کو کیا مجھ ترنم میں نے
 سر پہ سبزہ کے کھڑے ہو کے کہا تم میں نے غنچہ گل کو دیا ذوقِ تبسم میں نے
 فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے

جھونپڑے دامنِ کہسار میں دہقانوں کے
 ایک مکڑا اور مکھی

(داغود)

بچوں کے لیے

اک دن کسی مکھی سے یہ کہنے لگا مکڑا اس راہ سے ہوتا ہے گزر روزِ تمہارا
 لیکن مری کٹیبا کی نہ جا لگی کبھی قسم بھولے سے کبھی تم نے یہاں پاؤں نہ رکھا

غیروں سے نہ ملیے تو کوئی بات نہیں ہے
 انہوں سے مگر چاہیے یوں کہنے کے نہ رہنا
 وہ سلمے سیر صبی ہے جو منظور ہو آنا
 حضرت! کسی نادان کو دیجے گا یہ دھوکا
 اس جال میں کبھی کبھی آنے کی نہیں ہے

جو آپ کی سیر صبی پہ چڑھا پھر نہیں اترتا

مکڑے نے کہا: واہ! فریجے مجھے سمجھے
 منظور تمہاری مجھے خاطر تھی، دگر نہ
 اڑتی ہوئی آئی ہو خدا جانے کہاں سے
 اس گھر میں کئی تم کو دکھانے کی ہیں چیزیں
 لٹکے ہوئے دردازوں پر باریک ہیں پردے
 مہمانوں کے آرام کو حاضر ہیں، کچھونے
 مکھی نے کہا: خیر! یہ سب ٹھیک ہے لیکن
 تم سا کوئی نادان نہ ملنے میں نہ ہوگا
 کچھ فائدہ اپنا تو مرا اس میں نہیں تھا
 ٹھہر دجو مے گھر میں تو ہے اس میں نہ کیا
 باہر سے نظر آتی ہے چھوٹی سی یہ کٹیا
 دیواروں کو آئینوں سے ہے میں نے سجایا
 ہر شخص کو سماں یہ میسر نہیں ہوتا
 میں آپ کے گھر آؤں یہ امید نہ رکھنا

ان نرم بچہ نوں سے خدا تجھ کو بچائے

سو جائے کوئی ان پہ تو پھر اٹھ نہیں سکتا

مکڑے نے کہا دل میں سنی بات جو اس کی
 سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں
 یہ سوچ کے کبھی سے کہا اس نے بڑی بی
 ہوتی ہے اُسے آپ کی صورت سے محبت
 آنکھیں ہیں کہ ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں
 پھانسیوں سے کس طرح یہ کبخت ہے دانا
 دیکھو جسے دنیا میں خوشا مد کہلے بند
 اللہ نے بخشا ہے بڑا آپ کو رتبا!
 ہو جس نے کبھی ایک نظر آپ کو دیکھا
 سر آپ کا اللہ نے کلفی سے سجایا

یہ حسن، یہ پوشاک، یہ خوبی، یہ صفائی! پھر اس پہ فیامتہ ہے یہ اُڑتے ہوئے گانا
 کمنی نے سنی جب یہ خوشامد تو پسیمی بولی کہ نہیں آپ سے مجھ کو کوئی کھٹکا
 انکار کی عادت کو سمجھتی ہوں بُرائیں یہ ہے کہ دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا
 یہ بات کبھی اور اُڑی اپنی جگہ سے پاس آئی تو مکھڑے نے اچھل کر اسے پکڑا

بھوکا تھا کئی روز سے اب ہاتھ جو آئی
 آرام سے گھر بیٹھ کے، مکھی کو اُڑا یا

ایک پہاڑ اور گلہری

(ماخوذ از ایرسن)

بچوں کے لیے

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے تجھے ہوشرم، تو پانی میں جا کے ڈوب مرے
 ذرا سی چیز ہے، اس پر غرور! کیا کہنا! یہ عقل اور یہ سمجھ، یہ شعور! کیا کہنا!
 خدا کی شان ہے نا چیز چیز بن بیٹھیں! جو بے شعور ہوں، یوں باتیں بن بیٹھیں
 تیری بساط ہے کیا؟ میری شان کے آگے؟ زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے
 جو بات مجھ میں ہے تجھ کو دیکھ نصیب کہاں؟

بھلا پہاڑ کہاں؟ جا نور غریب کہاں؟

کہا یہ سن کے گلہری نے منہ سنبھال ذرا یہ کچی باتیں ہیں دل سے انھیں نکال ذرا
 جو میں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پسدا! نہیں ہے تو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا

ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے کوئی بڑا، کوئی چھوٹا یہ اس کی حکمت ہے
 بڑا جہان میں تجھ کو بنا دیا اُس نے تجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اس نے
 قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں نری بڑائی ہے، خوبی ہے! اور کیا تجھ میں
 جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہزدکھا مجھ کو یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں !
 کوئی بڑا نہیں قدرت کے کارخانے میں

ایک گلے اور بکری

(ماخوذ)

بچوں کے لیے

اک چراگاہ ہری بھری تھی کہیں تھی سراپا بہار جس کی زمیں
 کیا سماں اُس بہار کا ہو بیاں ہر طرف صاف ندیاں تھیں رواں
 تھے اناروں کے بے شمار درخت اور پیپل کے سایہ دار درخت
 ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں طائروں کی صدائیں آتی تھیں
 کسی ندی کے پاس اک بکری چرتے چرتے کہیں سے آنکلی
 جب ٹھہر کر ادھر ادھر دیکھا پاس اک گلے کو کھڑے پایا
 پہلے جھمک کر اُسے سلام کیا پھر سلیقے سے یوں کلام کیا
 کیوں بڑی بی! مزاج کیسے ہیں گلے بولی کہ خیر اچھے ہیں

ہے مصیبت میں زندگی اپنی
 اپنی قسمت بُری ہے، کیا کہیے
 رد رہی ہوں بُروں کی جان کو میں
 پیش آیا لکھا نصیبوں کا
 اس سے پالا پڑے، خدا نہ کرے!
 ہوں جو دُہلی، تو بیچ کھاتا ہے
 کن فریبوں سے رام کرتا ہے!
 دودھ سے جان ڈالتی ہوں میں
 میرے اللہ! تری دہائی ہے!
 بولی ایسا گلہ نہیں اچھا
 میں کہوں گی مگر خدا لگتی
 یہ ہری گھاس اور یہ سایہ
 یہ کہاں، بے زباں غریب کہاں
 لطف سارے اسی کے دم سے ہیں
 قید ہم کو بھلی، کہ آزادی؟
 واں کی گزران سے بجائے خدا!
 ہم کو زیبا نہیں گلہ اس کا
 آدمی کا کبھی گلہ نہ کر د
 آدمی کے گلے سے پچھتاؤ

کٹ رہی ہے بُری بھلی اپنی
 جان پر آہنی ہے، کیا کہیے!
 دیکھتی ہوں خدا کی شان کو میں
 زور چلتا نہیں غریبوں کا
 آدمی سے کوئی بھلا نہ کرے
 دودھ کم دوں تو بڑبڑاتا ہے
 ہتھکنڈوں سے غلام کرتا ہے!
 اس کے بچوں کو پالتی ہوں میں
 بدلے نیکی کے یہ بُرائی ہے
 سن کے بکری یہ ماجرا سارا
 بات سچا ہے بے مزا لگتی
 یہ چراگہ، یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
 ایسی خوشیاں ہمیں نصیب کہاں!
 یہ مزے آدمی کے دم سے ہیں
 اس کے دم سے ہے اپنی آبادی
 سو طرح کا بنوں میں ہے کھٹکا
 ہم پہ احسان ہے بڑا اس کا
 قدر آرام کی انگر سمجھو
 گائے سن کر یہ بات شرمائی

دل میں پرکھا بُرا بھلا اس نے اور کچھ سوچ کر کہا اس نے
یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو لگتی ہے بات بکری کی

بچے کی دعا

(ماخوذ)

بچوں کے لیے

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری زندگی شمع کی صورت ہو خلیا میری
دُور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے
ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چین کی زینت
زندگی ہو میری پردانے کی صورت یا رب علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کہنا درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
مرے اللہ! بُرائی سے بچا نا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

۴ دردم سے مرے دنیا کا اندھیرا ہو جائے

۵ (مترجم علی گٹ ناروا) دارد

۶ (مترجم علی گٹ ناروا) دارد

ہمدردی

(ماخوذ از ولیم کوپر)

بچوں کے لیے

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا	بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی	اُڑنے چکنے میں دن گزارا
پہنچوں کس طرح آشیاں تک	ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سن کر بلبل کی آہ وزاری	جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے	کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری	میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل	چمکا کے مجھے دیا بنایا

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

مہاں کا خواب

(ماخوذ)

بچوں کے لیے

میں سوئی جو اک شب تو دیکھا یہ خواب
یہ دیکھا کہ میں جا رہی ہوں کہیں
لرزتا تھا ڈر سے مرا بال بال
جو کچھ حوصلہ پا کے آگے بڑھی
زمررد سی پوشاک پہنے ہوئے
دہ چپ چاپ تھے آگے پیچھے رواں
اسی سوچ میں تھی کہ میرا پس
دہ پیچھے تھا اور تیز چلتا نہ تھا
کہا میں نے پہچان کر میری جاں
جدائی میں رہتی ہوں میں بے قرار
نہ پروا ہمارے ذرا تم نے کی
جو بچے نے دیکھا مرا پیچ دتاب
رلاتی ہے تجھ کو جدائی مری

بڑھا اور جس سے مرا اضطراب
اندھیرا ہے اور راہ ملتی نہیں
قدم کا تھا وحشت سے اٹھنا محال
تو دیکھا قطار ایک لڑکوں کی تھی
دیئے سب کے ہاتھوں میں جلتے ہوئے
خدا جانے جانا تھا ان کو کہاں؟
مجھے اس جماعت میں آیا نظر
دیا اس کے ہاتھوں میں جلتا نہ تھا
مجھے چھوڑ کر آگئے تم کہاں؟
پروتی ہوں ہر روز اشکوں کے ہار
گئے چھوڑ، اچھی دفاتم نے کی
دیا اس نے منہ پھیر کر یوں جواب
نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی مری

یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک چپ رہا دیا پھر دکھا کر یہ کہنے لگا
 سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اسے ؟
 ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے !

پرنندے کی فریاد

بچوں کے لیے

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانہ
 آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی اپنی خوشی سے آنا، اپنی خوشی سے جانا
 لگتی ہے چوٹ دل پر آتے یاد جس دم شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا
 وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی موت آباد جس کے دم سے تنہا میرا آشیانہ

آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں

ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں

کیا بد نصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں ساقی تو میں وطن میں، میں قید میں پڑا ہوں
 آئی بہار کلیاں پھولوں کی نہیں رہی ہیں میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں

اس قید کا الہی دیکھڑا کسے سناؤں

ڈرے یہیں قفس میں، میں غم سے مرنے جاؤں

جب سے جن چمٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے دل غم کو کھارہا ہے، غم دل کو کھارہا ہے
 گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

آزاد مجھ کو کر دے اور قید کرنے والے

میں بے زباں ہوں قیدی، تو چھوڑ کر دعا لے !

خفتگانِ خاک سے استفسار

مہرِ روشن چھپ گیا اٹھی نقابِ ردائے شا
یہ سیبِ پوشی کی تیاری کسی کے غم میں ہے
کر رہا ہے آسماں جادو لبِ گفتار پر
غوطہ زرنِ دریلے خاموشی میں ہے موجِ ہوا
دل کہ ہے بیتابیِ الفت میں دنیائے نفور
شانہ ہستی یہ ہے بکھرا ہوا گیسوئے شام
محفلِ قدرت مگر خورشید کے ماتم میں ہے
ساحرِ شب کی نظر ہے دیدہ بیدار پر
ہاں، مگر اک دوسرے آتی ہے آوازِ دردا
کیونچ لایا ہے مجھے ہنگامہ عالم سے دور

منظرِ حرامِ نصیبی کا تماشا ئی ہوں میں

ہم نشینِ خفتگانِ گنجِ تنہائی ہوں میں

تھم ذرا بیتابیِ دل! بیٹھ جانے دے مجھے
اے مئے غفلت کے شرسنو! کہاں رہتے ہو تم؟
وہ بھی حیرت خانہٴ مرد و فردا ہے کوئی؟
آدمیِ داں بھی حصارِ غم میں ہے محصور کیا؟
داں بھی جلِ منزل ہے سوزِ شمع پر پردانہ کیا؟
یاں تو اک مصرع میں پہلوئے نکل جاتا ہوں
رشتہٴ دچونِ دیاں کئے جان کا آزار ہیں
اس جہاں میں اک معیشت اور سوا افتاد ہے
کیا وہاں کچا بھی ہے، دھتقان بھی ہے، زہین بھی ہے؟
اور اس بستی پہ چار آنسو گرنے دے مجھے
کچھ کہو اس دیس کی آخر جہاں رہتے ہو تم
اور پیکارِ عناصر کا تماشا ہے کوئی؟
اس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا؟
اس جن میں بھی لگی دبلبل کا ہے افسانہ کیا؟
شعر کی گرجی سے کیا داں بھی گچھل جاتا ہوں؟
اس گلستاں میں بھی کیا ایسے ٹیکیلے خار ہیں؟
روح کیا اُس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے؟
قافلے دلتے بھی ہیں، اندیشہٴ زہن بھی ہے؟

تکے چنتے ہیں وہاں بھی آشیان کے واسطے؟ خشت و گل کی فکر ہوتی ہے مکاں کے واسطے؟

واں بھی انساں اپنی اصلیت سے بیگانے ہیں کیا؟ اختیارِ ملت وائیں کے دہولنے ہیں کیا؟

واں بھی کیا فریاد بلبل پر چین روتا نہیں؟

اس جہاں کی طرح واں بھی دردِ دل ہوتا نہیں؟

باغ ہے فردوس یا اک منزلِ آرام ہے؟ یا رخِ بے پردہ حینِ ازل کا نام ہے؟

کیا جہنم معصیت سوزی کی اک ترکیب ہے؟ آگ کے شعلوں میں پنہاں مقصدِ نادیب ہے؟

کیا عوضِ رفتار کے اس دیس میں پر دان ہے؟ موت کہتے ہیں جسے اہلِ زمیں کیا راز ہے؟

اضطرابِ دل کا سا ماں یاں کی ہست و بود ہے؟ ظلمِ انساں اس ولایت میں بھی کیا محدود ہے؟

دید سے تسکین پاتا ہے دلِ مہجور بھی؟ لنِ نرانی کہہ رہے ہیں یا وہاں کے طور بھی؟

جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا؟ واں بھی انساں جو قتلِ ذوقِ استفہام کیا؟

آہِ اودہ کشور بھی تاریکی سے کیا معمور ہے؟ یا محبت کی تجلی سے سراپا نور ہے؟

تم بتا دو راز جو اس گنبدِ گرِ داں میں ہے

موت اک چھمتا ہوا کا نثارِ دلِ انساں میں ہے

شمع و پروانہ

پروانہ تجھ سے کرتا ہے شمعِ اپیار کیوں؟ یہ جان بے قرار ہے تجھ پر نثار کیوں؟

سیلابِ دارِ رکعتی ہے تیری ادا سے؟ آدابِ عشق تو نے سکھائے ہیں کیا اسے؟

کرتا ہے یہ طوافِ تری جلوہ گاہ کا؟ پھونکا ہوا ہے کیا تری برقی نگاہ کا؟

آزارِ موت میں اسے آرامِ جاں ہے کیا؟
 غمِ خانہِ مہیاں میں جو تیری ضیاء نہ ہو
 شیطے میں تیرے زندگی جادواں ہے کیا؟
 گرناترے حضور میں اس کی نماز ہے
 اس تفتہ دل کا نخلِ نمنا ہر آنہ ہو؟
 کچھ اس میں جوشِ عاشقِ حینِ قائم ہے
 ننھے سے دل میں لذتِ سوز و گداز ہے
 چھوٹا سا طونو، یہ ذرا سا کلیم ہے
 پروانہ اور ذوقِ تماشا ئے روشنی!
 کبیرا ذرا سا اور تماشا ئے روشنی!

عقل و دل

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا
 ہوں زمیں پر گزرِ فلک پر مرا
 بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
 دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں
 کام دنیا میں رہبری ہے مرا
 مثلِ خضرِ نجستہ پا ہوں میں
 ہوں مفسرِ کتابِ ہستی کی
 بلند اک خون کی ہے تو لیکن
 غیرتِ لعلِ بے بہا ہوں میں
 دل نے سن کر کہا یہ سب سچ ہے
 پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں!
 رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے
 اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں!
 ہے تجھے واسطہِ مظاہر سے
 اور باطن سے آشنا ہوں میں
 علمِ تجھ سے تو معرفتِ مجھ سے
 تو خدا جو، خدا نما ہوں میں
 علم کی انتہا ہے بے تابی
 اس مرض کی لگہ و داہوں میں
 شمع تو محفلِ صداقت کی
 حسن کی بزم کا دیا ہوں میں

تو زمان و مہکاں سے رشتہ بیا طائرِ سدرہ آشنا ہوں میں

کس بلندی پہ ہے مقام مرا

عرشِ ربِّ جلیل کا ہوں میں

صدائے درد

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے ہاں ڈبوئے عجیبِ آبِ گنگا تو مجھے

سرزمینِ اپنی قیامت کی نفاقِ انگیز ہے وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراقِ انگیز ہے

بدلے یک رنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب ایکسا ہی خرمین کے دانوں میں جدائی ہے غضب

جس کے کھولوں میں انخت کی ہوا آئی نہیں اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں

لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں

اختلاطِ موجد و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

دانہِ خرمین نما ہے شاعرِ معجز بیاں ہونہ خرمین ہی تو اس دلنے کی ہستی پھر کہاں

حسن ہو کیا خود نما، جب کوئی مال ہی نہ ہو شمع کو جلنے سے کیا مطلب، جو محفل ہی نہ ہو

ذوقِ گویائیِ نموشی سے بدلتا کیوں نہیں میرے آئینے سے یہ جو ہر نکلتا کیوں نہیں

کب زباں کھولی ہماری لذتِ گفتار نے

پھونک ڈالا جب چمن کو آتشِ پیکار نے

آفتاب

(ترجمہ گایتری)

اے آفتاب! ارد گردِ دانِ جہاں ہے تو
باعث ہے تو وجودِ عدم کی نمود کا
قائم یہ مُنصُروں کا تماشائِ تجھی سے ہے
ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
اے آفتاب! ہم کو ضیاءِ شعور دے
ہے محفلِ وجود کا سماں طراز تو
تیرا کمال ہستی ہر جہاندار میں
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو
نہ ابتداء کوئی، نہ کوئی انتہا تری
آزادِ قیدِ اول و آخر ضیا تری

شمع

بزمِ جہاں میں میں بھی ہوں اے شمع! اور مند
دی عشق نے حرارتِ سوزِ دردوں تجھے
فریادِ درگہ صفتِ دانہ سپند
اور لگی فروشنِ اشکِ شفق گول کیا تجھے
ہو شمع بزمِ عیش کہ شمعِ مزار تو
ہر حالِ اشکِ غم سے رہی ہمکنار تو

یک ہیں تری نظر صفت عاشقانِ راز میری نگاہ مایہ آشوبِ امتیاز
 کعبے میں، بتکدے میں ہے کیسا تری ضیا میں امتیاز دیرِ دحرم میں پھنسا ہوا
 ہے شانِ آہ کی ترے دو درسیاہ میں
 پوشیدہ کوئی دل ہے تری جلوہ گاہ میں؟

جلتی ہے تو کہ برقِ تجلی سے دور ہے بیدار دتیرے سوز کو سمجھ کہ فور ہے
 تو جل رہی ہے اور تجھے کچھ خبر نہیں بینا ہے اور سوزِ دروں پر نظر نہیں
 میں جوشِ اضطراب سے سیماب دار بھی آگاہِ اضطرابِ دل بے قرار بھی
 تمنا یہ بھی کوئی ناز کسی بے نیاز کا
 احساس دے دیا مجھے اپنے گداز کا

یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بے قرار خوابیدہ اس شر میں ہیں آتش کدے ہزار
 یہ امتیازِ رفعت و بستی اسی سے ہے! گل میں مہک، شراب میں مستی اسی سے ہے!
 بستانِ دبلیل و گلِ دبو ہے یہ آگہی
 اصل کشاکشِ من و تو ہے یہ آگہی

صبحِ ازل جو حسنِ ہوا دِلستانِ عشق آوازِ گُن ہوئی تپشِ آموزِ جانِ عشق
 یہ حکمِ تمنا کہ گلشنِ گُن کی بہار دیکھ ایک آنکھ لیکے خواب پریشاں ہزار دیکھ
 مجھ سے خبر نہ پوچھ حجابِ وجود کی! شامِ فراق، صبحِ نقی میری نمود کی
 وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا زریبِ درختِ طور مرا آشیانہ تھا
 قیدی ہوں اور قفس کو چین جانتا ہوں میں غریب کے غمکدے کو وطن جانتا ہوں میں

یادِ وطنِ فسرِ درگی بے سببِ بنی
 شوقِ نظرِ کبھی، کبھی زوقِ طلبِ بنی

اے شمع ! انتہائے فریب خیال دیکھ
مضمون فراق کا ہوں، شریا نشان ہوں میں
باندھا مجھے جو اس نے تو چاہی مری نمود
گوہر کو مشتِ خاک میں رہنا پسند ہے
چشمِ غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے
یہ سلسلہ زمان و مکان کا کنہ ہے
منزل کا اشتیاق ہے، گم کردہ راہ ہوں
عتیاد آپ، حلقہٴ دامِ ستم بھی آپ !
میں حسن ہوں کہ عشق سراپا گزار ہوں !
مسجود ساکنانِ فلک کا آل دیکھ
آہنگِ طبعِ ناظم کون دمکاں ہوں میں
تحریر کر دیا سر دیوانِ ہست و بود
بندش اگر چہ سست ہے مضمون بلند ہے
عالمِ ظہورِ جلوہٴ ذوقِ شعور ہے
طوقِ گلوئے حسن تماشا پسند ہے
اے شمع ! میں اسیرِ فریب نگاہ ہوں
بامِ حرم بھی، طائرِ بامِ حرم بھی آپ !
کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں !

ہاں آشناے لب ہو نہ راز کہن کہیں
پھر چھپر نہ جاکے قصہٴ دار و در سن کہیں

ایک آرزو

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب !
شورش سے بے گنا ہوں دلِ ڈھونڈنا میرا
موتا ہوں خاموشی پر ایہ آرزو ہے میری
آزاد فکر سے ہوں، تحریک میں دن گزار دوں
لذتِ سرود کی ہر چیزِ بلبوں کے چہچہوں میں
گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بچھ گیا ہو
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو !
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
دنیا کے غم کا دل سے کاٹنا نکل گیا ہو
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
ساغر و ساگو یا مجھ کو جہاں نہا ہو

ہو ہاتھ کا سرمہ ناسبزہ کا ہو بچھونا
 انوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
 صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہر پہلوں
 ہو دل فریب ایسا کہ سار کا نظارہ
 آغوش میں زمیں کی سو یا ہوا ہو سبزہ
 پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
 مہندی لگائے سورج جب شام کی دہن کو
 راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تمکے کے جسم
 بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے
 پچھلے پہر کی کوئل، وہ صبح کی مژدن
 کانوں پہ ہونے میرے دیرِ دھرم کا احساں
 پھولوں کو آئے جس دم شبنم دمنو کرانے
 اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
 شرمائے جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو
 نتھے سے دل میں اس کے کھٹکانہ کچھ مرا ہو
 ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
 پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
 پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
 جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
 سرخی لیے سنہری ہر بھول کی قبا ہو
 امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو
 جب آسمان پہ ہر سو بادل گھبرا ہوا ہو
 میں اس کا ہمنوا ہوں، وہ میری ہمنوا ہو
 روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو
 رونا مراد منو ہو، نالہ مری دعا ہو
 تار و نمکے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر درد مند دل کو رونا مرار لا دے
 بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگادے

آفتاب صبح

شورشِ میخانہٴ انساں سے بالاتر ہے تو
 زینتِ بزمِ فلک ہو جس سے، وہ ساغر ہے تو

ہو در گوشِ عروس صبح، وہ گوہر ہے تو جس پر سیلے رافقِ نازاں ہودہ زبور ہے تو

صفوۂ ایام سے داغِ مہرِ شبِ مٹا!

آسمان سے نقشِ باطل کی طرح کوکبِ مٹا!

حسنِ تیراجب ہوا بامِ فلک سے جلوہ گر آنکھ سے اڑتا ہے یکدم خواب کی مے کا اثر

نور سے معمور ہو جاتا ہے دامنِ نظر کھولتی ہے چشمِ ظاہر کو منیا تیری مگر

ڈھونڈتی ہیں جس کو آنکھیں وہ تماشا چاہیے

چشمِ باطن جس سے کھل جائے وہ جلو اچا ہیے

شوقِ آزادی کے دنیا میں نکلے حوصلے زندگی بھر قیدِ زنجیرِ تعلق میں رہے

زیرِ وبالِ ایک ہیں تیری نگاہوں کے لیے آرزو ہے کچھ اسی چشمِ تماشا کی مجھے

آنکھ میری ادر کے غم میں سرشکِ آباد ہو

انتیازِ ملت و آئیں سے دل آزاد ہو!

بسنہ رنگِ خصوصیت نہ ہو میری زباں نوعِ انساں قوم ہو میری، وطن میرا جہاں

دیدہ باطن پہ رازِ نظمِ قدرت ہو عیاں ہوشناسائے فلکِ شمعِ تخیل کا دھواں

عقدہٴ اصدا کی کاوش نہ تڑپائے مجھے!

حسنِ عشقِ انگیز ہر شے میں نظر آئے مجھے

مدد آجائے ہوا سے گل کی پتی کو اگر! اشکِ بنِ کیمیری آنکھوں سے ٹپک جائے اثر

دل میں ہو سوزِ محبت کا وہ چھوٹا سا شرر نور سے جس کے طے رازِ حقیقت کی خبر

شاہِ قدرت کا آئینہ ہو دل میرا نہ ہو!

سر میں جز ہر ردیٰ انساں کو فی سودا نہ ہو!

تو اگر زحمت کش ہنگامہ عالم نہیں یہ فضیلت کا نشان ہے تیرا عظم نہیں
اپنے حسن عالم آرا سے جو تو محرم نہیں ہمسریک ذرہ خاک در آدم نہیں

نورِ مسجود ملکِ مگر تم تماشا ہی رہا

اور تو منت پذیر صبحِ فردا ہی رہا

آرزو نورِ حقیقت کی ہوائے دلیں ہے لیلیٰ ذوقِ طلب کا گھراسی حمل میں ہے
کس قدر لذت کشود عقدہ مشکلاں میں ہے لطفِ مد حاصل ہماری سعی بے حاصل میں ہے

دردِ اسفہام سے واقف نہ پہلو نہیں

جستجوئے رازِ قدرت کا شناسا تو نہیں

دردِ عشق

اے دردِ عشق! ہے گہر آبِ دار تو نا محرموں میں دیکھ نہ ہوا شکار تو!

پنہاں تر نقابِ تری جلوہ گاہ ہے ظاہر پرستِ محفلِ نو کی نگاہ ہے

آئی نئی ہوا چمنِ ہست دبود میں اے دردِ عشق! اب نہیں لذت نمود میں

ہاں! خود نمایوں کی تجھے جستجو نہ ہوا! منت پذیرِ نالہ بلسل کا تو نہ ہوا!

خالی شرابِ عشق سے لالے کا جام ہو پانی کی بوندِ گریہِ شبنم کا نام ہو

پنہاں دردِ سینہ کہیں راز ہو ترا اشکِ جگر گسار نہ غماز ہو ترا

گویا زبانِ شاعرِ رنگیں بیاں نہ ہو آوازِ نئے میں شکوہِ فرقت نہاں نہ ہو

یہ دورِ نکتہ چیں ہے کہیں چھپ کے بیٹھ رہ

جس دل میں تو کہیں ہے وہیں چھپ کے بیٹھ رہ

غافل ہے تجھ سے حیرتِ علم آفریدہ دیکھ! جو یا نہیں تیری نگہ نارسیدہ دیکھ
 رہنے دے جستجو میں خیالی بلند کو حیرت میں چھوڑ دیدہ حکمت پسند کو
 جس کی بہارتو ہو یہ ایسا چمن نہیں قابل تری نمود کے یہ انجمن نہیں
 یہ انجمن ہے کشتہٗ نظارہٗ مجاز مقصد تری نگاہ کا خلوت سراے راز

ہر دل مئے خیالی کی مستی سے چور ہے
 کچھ اور آج کل کے کلیموں کا طور ہے

گل پرشمرودہ

کس زبان سے اے گل پرشمرودہ تجھ کو گل کہوں کس طرح تجھ کو تمنائے دل بلبل کہوں
 تھی کبھی موجِ صبا گھوڑا رہ جنباں ترا نام تھا مچن گلستان میں گلِ خنداں ترا
 تیرے احساں کا نسیم صبح کو اقرار تھا
 باغِ تیرے دم سے گویا طبلہٗ عطار تھا

تجھ پہ برساتا ہے شبنم دیدہ گریاں مرا ہے نہاں تیری اُداسی میں دلِ دیباں مرا
 میری بربادی کی ہے چھوٹی سی اک تصویر تو خواب میری زندگی تھی جس کی ہے تعبیر تو
 ہم چو نے از نیستانِ خود حکایت می کنم
 بشنوائے گل! از ہدایہا شکایت می کنم

سیر کی لوحِ تربیت

اے کثیر مرغِ جانِ تارِ نفس میں ہے اسیر اے کثیر یارِ روح کا طائرِ نفس میں ہے اسیر

اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آنا دی تو دیکھ شہرِ حجاز ا ہوا تھا اس کی آبادی تو دیکھ
فکر نہ ہنی تھی مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی صبر و استقلال کی کمی تھی کا حاصل ہے یہی

سنگِ تربت ہے مرا اگر دیدہ تقریر دیکھ
چشمِ باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھانا کہیں
وانہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامہ محشر یہاں
دصل کے اسباب پیلا ہوں تری تحریر سے دیکھ! کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیر
رنگِ پر جواب نہ آئیں ان خسانوں کو نہ چھیر

تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا
عرضِ مطلب ہے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پر و اتجھے

بندہ مومن کا دل ہم دریا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

ہوا اگر ہاتھوں میں تیرے خامہ معجزہ رقم شیشہ دل ہوا اگر تیرا مثالِ جامِ جم
پاک رکھ اپنی زباں، تمبیزِ رحمانی ہے تو! ہونہ جلے دیکھنا تیری صدا بے آبرو!

سونے والوں کو جگادے شر کے اعجاز سے
خرمِ باطل جلا دے شعلہ آواز سے

ماہِ نو

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل ایک ٹکڑا تیرتا پھر تاپے روئے آپِ نیل
طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب نشرِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصیرِ آفتاب؟

چرخ نے بالی چڑائی ہے عروسِ شام کی؟

نیل کے پانی میں یا جھپٹی ہے سیمِ فام کی؟

قاقلِ تیرا رواں بے منتِ بانگِ درا گوشِ انسان سن نہیں سکتا تیری آوازِ پرا
گھٹنے بڑھنے کا سماں آنکھوں کو دکھلاتا ہو تو ہے وطنِ تیرا کہ مصر؟ کس دیس کو جاتا ہے تو؟

ساتھ ملے ستارے ثابت نہ لے چل مجھے خارِ حسرت کی خلش رکھتی ہے اب بیکل مجھے

نور کا طالب ہوں گھبراتا ہوں اس بستی میں

طفلِ کربِ بیمار پا ہوں مکتبِ ہستی میں

انسان اور بزمِ قدرت

شمعِ خورشیدِ درخشاں کو جو دیکھا میں نے بزمِ معمورہ ہستی سے یہ پوچھا میں نے

پرتے مہر کے دم سے ہے اُجالا تیرا سیمِ سبّال ہے پانی ترے دریاؤں کا

مہر نے نور کا زیور تجھے پہنایا ہے تیری محفل کو اسی شمع نے چمکایا ہے

گل و گلزارِ ترے خلد کی نصیبِ یریں ہیں یہ سبھی سورہ والشمس کی تفسیر ہیں

سُرخ پوشاک ہے پھولوں کی، دوختور کی ہری تیری محفل میں کوئی سبز، کوئی لال پری

ہے ترے خیمہ گردوں کی طلائی جھال بدلیاں لال سی آتی ہیں افق پر جو نظر

کیا بھلی لگتی ہے آنکھوں کو شفق کو لالی
 رتبہ تیرا ہے بڑا، شان بڑی ہے تیری
 مے گلہ رنگ خم شام میں تو نے ڈالی
 صبح اک گیت سراپا ہے تری سطوت کا
 پر وہ نور میں مستور ہے ہر شے تیری
 زیرِ خورشید نشانِ تکیا بھی نہیں ظلمت کا
 میں بھی آباد ہوں اس نور کی بستی میں گر

نور سے دور ہوں ظلمت میں گر قیام میں

کیوں سیرِ روزِ سببِ بخت، سببِ کار ہوں میں؟

میں یہ کہتا تھا کہ آواز کہیں سے آئی
 ہے ترے نور سے دالبہ نری بود و نبود
 بامِ گر دوں سے دیا سخنِ زمیں سے آئی
 انجمنِ سن کی ہے تو تری تصویر ہوں میں
 باغباں ہے تری ہستی پے گلزارِ وجود
 عشق کا تو ہے صحیفہ، تری تغیر ہوں میں
 میرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تو نے
 اور بے منتِ خورشید چمک ہے تیری
 ہونہ خورشید تو دیراں ہو گلستاں میرا
 منزلِ عیش کی جا، نام ہو زنداں میرا
 آہ! اے رازِ عیاں کہ نہ سمجھنے والے!
 حلقہٴ دامِ تمنا میں الجھنے والے
 ہائے غفلت! کہ تری آنکھ ہے پابندِ مجاز
 نازِ زیبا تھا تجھے، تو ہے مگر گرم نیاز

تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے

نہ سیرِ روزِ سببِ بخت، نہ سببِ کار رہے

پیام صبح

(ماخوذ از لانگ فیلو)

اُجالا جب ہو رخصت جبین شب کی افشاں کا
جگایا بلبلی رنگیں نو اکو آشتیا نے میں
طلسمِ ظلمتِ شب سورہ وَاَنْوَر سے توڑا
پڑھا خوابیدگانِ دیر پر افسونِ بیداری
ہوئی بامِ حرم پر آکے یوں گویا مؤذن سے
پکاری اس طرح دیارِ گلشن پر کھڑے ہو کر
دیباچہ مکمل صحرائیں، چلو اے قافلے والو!
سوئے گویا بیاں جب گئی زندوں کی بستی سے

نسیمِ زندگی پیغام لائی صبحِ خداں کا
کنارے کعبیت کے شانہ ہلایا اسنے دہقان کا
اندھیرے میں اڑایا تاجِ زریعِ شبستاں کا
برہمن کو دیا پیغام خورشیدِ درخشاں کا
نہیں کھٹکا ترے دل میں نمودِ مہرِ تاباں کا
چٹک اذغیجی لگی! تو مؤذن ہے گلستاں کا
چمکنے کو ہے جگنو بن کے ہر ذرہ بیاباں کا
تویوں بولی نظارہ دیکھ کر شہرِ فموشاں کا

ابھی آرام سے لیٹے رہو میں پھر بھی آؤں گی!
سلا دوں گی جہاں کو، خواب سے تم کو جگاؤں گی

عشق اور موت

(ماخوذ از طینی سن)

سہانی نمودِ جہاں کی گھڑی تھی
تبسمِ فناں زندگی کی کلی تھی
کہیں مہر کو تاجِ زر مل رہا تھا
عطا چاند کو چاندنی ہو رہی تھی
سیہ پیر بنِ شام کو دے رہے تھے
ستاروں کو تعلیمِ تابندگی تھی

کہیں شاخ ہستی کو لگتے تھے پتے
کہیں زندگی کی کلی بیٹھتی تھی
فرشتے سکھاتے تھے شبنم کو رونا
ہنسی گل کو پہلے پہل آ رہی تھی
عطا درد ہوتا تھا شاعر کے دل کو
خودی نشہ کا مے بے خودی تھی
اٹھی آدل آدل گھٹا کالی کالی
کوئی حور چوٹی کو کھوئے کھڑکی تھی

زمین کو تھا دغوی کہ میں آسمان ہوں

مکان کہہ رہا تھا کہ میں لامکان ہوں

غرض اس قدر یہ نظارہ تھا پیارا
کہ نظارگی ہو سراپا نظارہ
ملک آزماتے تھے پرواز اپنی
جبینوں سے نور ازل آشکارا
فرشتہ تھا اک عشق تھا نام جس کا
کہ تھی رہبری اس کی سب کا سہارا
فرشتہ کہ چلا تھا بیتابیوں کا
ملک کا ملک اور پارے کا پارا
پے سیر فردوس کو جا رہا تھا
قضا سے طاراہ میں وہ قضا را
یہ پوچھا "ترا نام کیا ہے کام کیا ہے؟
نہیں آنکھ کو دیدنیری گوارا
ہوا سن کے گویا قضا کا فرشتہ
اڑتی ہوں میں رخت ہستی کے پرے
مری آنکھ میں جادوئے نیستی ہے
گرا ایک ہستی ہے دنیا میں ایسی
شرین کے رمتی ہے انسان کے دلیں
ٹپکتی ہے آنکھوں بن بن کے آنسو
سنی عشق نے گفتگو جب قضا کی
اجل ہوں، مرا کام ہے آشکارا
بھاتی ہوں میں زندگی کا شرارا
پیام فنا ہے اسی کا اشارا
دہ آتش ہے میں سامنے اس کے پارا
وہ ہے نور مطلق کی آنکھوں کا تارا
دہ آنسو کہ ہو جن کی تلخی گوارا
ہنسی اس کے لب پر ہوئی آشکارا

گری اس تبسم کی بچلی اجل پر اندھیرے کا ہنور میں کیا گوارا ؟

بقا کو جو دیکھا فنا ہو گئی وہ

قننا تھی، شکارِ قضا ہو گئی وہ

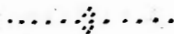
زہد اور زندگی

تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی
کرتے تھے ادب ان کا اعلیٰ دادانی
جس طرح کہ الفاظ میں مضمر ہوں معانی
تھی تہ میں کہیں دردِ خیالی ہمہ دانی
منظور تھی تعدادِ مریدوں کی بڑھانی
تھی رند سے زاہد کی ملاقات پرانی
اقبال کہ ہے قمری شمشادِ معانی
گو شعر میں ہے رشکِ کلیم ہمہ دانی
ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی
تفضیل علیٰ ہم نے سنی اس کی زبانی
مقصود ہے مذہب کی مگر خاکِ اڑانی
عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پرانی
اس ریز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی
بے داغ ہے مانندِ سحر اس کی جوانی

اک مولوی صاحب کی سنانا ہوں کہانی
شہرہ تھا بہت آپ کی صوفی منشی کا
کہتے تھے کہ پنہاں ہے تصوف میں شریعت
بریزے زہد سے تھی دل کی صراحی
کرتے تھے بیان آپ کرامات کا اپنی
مدت سے رہا کرتے تھے ہمسے میں میرے
حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا
پابندی احکام شریعت میں ہے کیسا؟
سننا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا
سمجھا ہے کہے راگ عبادت میں داخل
کچھ عار سے حسنِ فردشوں سے نہیں ہے
گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
لیکن یہ مستا اپنے مریدوں سے ہے میں نے

مجموعہ افراد ہے اقبال نہیں ہے
 رندی سے بھی آگاہ، شریعت سے بھی واقف
 اس شخص کی ہم پر تحقیقت نہیں کھلتی
 الفصہ بہت طول دیا وعظ کو اپنے
 اس شہر میں جو بات ہو، اڑجاتی سب میں
 اک دن جو سر راہ ملے حضرت زاہد
 فرمایا، شکایت وہ محبت کے سبب تھی
 میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے
 خم ہے سر تسلیم مرا آپ کے آگے
 گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت
 میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
 مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
 دل دفتر حکمت ہے، طبیعت خُفّاقانی
 پوچھو جو تصوف کی، تو منصور کا ثانی
 ہو گا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی
 نادیر رہی آپ کی یہ نغز بیانی
 میں نے بھی سنی اپنے احبّاء کی زبانی
 پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی
 متافرض مرا راہ شریعت کی دکھانی
 یہ آپ کا حق متنازعہ قربِ مکاری
 پیری ہے تواضع کے سبب میری جوانی
 پیدا نہیں کچھ اس سے قصور ہمدانی
 گھرا ہے مرے بحر خیالات کا پانی
 کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانہ

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
 کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے!



شاعر

قوم گو یا جسم ہے، افراد ہیں اعضائے قوم
 منزلِ صنعت کے رہ پیا ہیں دست و پائے قوم
 محفلِ نظم حکومت، چہرہ زیبائے قوم
 شاعر رنگیں نوا ہے دیدہ بینائے قوم
 بتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ
 کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

دل

قصہ دار و رسن بازی طفلانہ دل
 یارب! اس ساغرِ لیریز کی مے کیا ہوگی!
 ابرِ رحمت تھا کہ نفی عشق کی بجلی یارب!
 حسن کا گنج گرا نہ سایہ تجھے مل جاتا
 عرش کا بے کبھی کعبہ کا ہے دھوکا اس پر
 اس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا
 تو سمجھتا نہیں اے زاہدِ نادان! اس کو
 خاک کے ڈھیر کو اکسیر بنا دیتی ہے
 التجائے اربنی سرخی افسانہ دل
 جادہ ملک بقا ہے خطِ پیمانہ دل
 جل گئی مزرعِ ہستی تو آگادانہ دل
 تو نے فرما دیا نہ کھودا کبھی دیوانہ دل
 کس کی منزل ہے الہی! مرا کاشانہ دل
 دل کسی اور کا دیوانہ، میں دیوانہ دل
 رشکِ صد سجدہ ہے اک لغزشِ مستانہ دل
 وہ اثر رکھتی ہے خاکستر پر دانہ دل

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے
 برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

موج دریا

مضطرب رکھتا ہے میرا دل بیتاب مجھے عین مستی ہے تڑپ صورتِ سیما مجھے
موج ہے نام مرا، بحر ہے پایا ب مجھے ہونہ زنجیر کبھی حلقہ گر داب مجھے

آب میں مثل ہوا جاتا ہے تو سن میرا

خارِ ماہی سے نہ اٹکا کبھی دامن میرا

میں اچھلتی ہوں کبھی جذبِ مہِ کمال سے جوش میں سر کو ٹپکتی ہوں کبھی ساحل سے

ہوں وہ رہر دکہ محبت ہے مجھے منزل سے کیوں نظر پتی ہوں، یہ پوچھے کوئی میرے دل سے

رحمتِ تنگی دریا سے گریزاں ہوں میں

وسعتِ بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

رخصت اے بزمِ جہاں!

(ماخوذ از ایمرسن)

رخصت اے بزمِ جہاں! سوئے وطن جاتا ہوں میں

آہ اس آباد دیرا نے میں گھبراتا ہوں میں

بسکہ میں افسردہ دل ہوں، درخورِ محفل نہیں

تو مرے قابل نہیں ہے، میں ترے قابل نہیں

قید ہے دربار سلطان و شہستانِ وزیر
 توڑ کر نکلے گا زنجیرِ طلائع کا اسیر
 گو بڑی لذت تری ہنگامہ آرائی میں ہے
 اجنبیت سی مگر تیری شناسائی میں ہے
 مدتوں تیرے خود آراؤں سے ہم صحبت رہا
 مدتوں بے تاب موجِ بحر کی صورت رہا
 مدتوں بیٹھنا ترے ہنگامہ عشرت میں ہیں
 روشنی کی جستجو کرتا رہا ظلمت میں ہیں
 مدتوں ڈھونڈا کیا نظارہ گل خاریں
 آہ! وہ یوسف نہ ہاتھ آیا ترے بازار میں
 چشمِ حیراں ڈھونڈتی اب اور نظارے کو ہے
 آرزو ساحل کی مجھ طوفان کے مارے کو ہے
 چھوڑ کر مانندِ بُو، تیرا چین جاتا ہوں میں!!
 رخصت اے بزمِ جہاں سوئے وطن جاتا ہوں میں
 گھر بنایا ہے سکونتِ دامنِ کہسار میں
 آہ! یہ لذت کہاں موسیقیِ گفتار میں!
 ہم نشینِ نرگس شہلا، رفیقِ گل ہوں میں
 ہے چین میرا وطن، ہمسایہ بلبیل ہوں میں

شام کو آواز چشموں کی سلاتی ہے مجھے
 صبح فرشِ سبز سے کوئل جگاتی ہے مجھے
 بزمِ ہستی میں ہے سب کو محفلِ آرائی پسند
 ہے دلِ شاعر کو لیکن کنجِ تنہائی پسند
 ہے جنوں مجھ کو کہ گھبراتا ہوں آبادی میں میں
 ڈھونڈتا پھرتا ہوں کس کو کوہ کی وادی میں
 شوق کس کا سبزہ زاروں میں پھرتا ہے مجھے؟
 اور چشموں کے کناروں پر سلاتا ہے مجھے؟
 طعنہ زن ہے تو کہ شیدا کنجِ عزت کا ہوں میں
 دیکھ اے غافل! پیامی بزمِ قدرت کا ہوں میں
 ہم وطن شمشاد کا، قمری کا میں ہمارا ہوں
 اس چمن کی خامشی میں گوشِ برآواز ہوں
 کچھ جو سنتا ہوں تو اوروں کو سنانے کے لیے
 دیکھتا ہوں کچھ تو اوروں کو دکھانے کے لیے
 عاشقِ عزت ہے دل، نازاں ہوں اپنے گھر پہ میں
 خندہ زن ہوں مسندِ دارا و اسکندر پہ میں
 لیٹنا زیرِ شجر رکھتا ہے جادو کا اثر
 شام کے تارے پہ جب پڑتی ہے رہ رہ کر نظر
 علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اس کی نمود!
 گل کی جتنی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بود!

طفل شیرخوار

میں نے چا تو تجھ سے چھینا ہے تو چلاتا ہے تو
 مہرباں ہوں میں، مجھے نا مہرباں سمجھا ہے تو
 پھر پڑا روئے گا اے نودار و اقسیم غم !
 چبھ نہ جائے دیکھنا ! باریک ہے نوکِ قلم
 آہ ! کیوں دکھ دینے والی شے سے تجھ کو پیار ہے ؟
 کھیل اس کاغذ کے ٹکڑے سے یہ بے آزار ہے
 گیند ہے تیری کہاں ؟ چینی کی پٹی ہے کدھر ؟
 وہ ذرا سا جانور ٹوٹا ہوا ہے جس کا سر
 تیرا آئینہ تھا آزادِ غبارِ آرزو !
 آنکھ کھلتے ہی چمک اٹھا شرابِ آرزو
 ہاتھ کی جنبش میں، طرزِ دید میں پوشیدہ ہے
 تیری صورتِ آرزو بھی تیری نوزائیدہ ہے
 زندگانی ہے تری آزادِ قیدِ امتیاز
 تیری آنکھوں پر ہویدا ہے مگر قدرتِ کارزار
 جب کسی شے پر بگڑ کر مجھ سے چلاتا ہے تو
 کیا تماشا ہے ردی کاغذ سے من جاتا ہے تو

آہ! اس عادت میں ہم آہنگ ہوں میں بھی نرا
 تو تلوں آشنا، میں بھی تلوں آشنا
 عارضی لذت کا شیرازی ہوں، چلاتا ہوں میں
 جلد آجاتا ہے غصہ، جلد من جاتا ہوں میں
 میری آنکھوں کو لبھا لیتا ہے حسن ظاہری
 کم نہیں کچھ تیری نادانی سے نادانی مری
 تیری صورت گاہ گریاں، گاہ خنداں میں بھی ہوں
 دیکھنے کو نوجواں ہوں، طفلِ ناداں میں بھی ہوں

نصو پرورد

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستانِ میری
 خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری
 یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں؟
 یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری
 اٹھائے کچھ ورق لائے، کچھ تر گس نے، کچھ گل نے
 چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستانِ میری
 اڑالی قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے
 چمن والوں نے مل کر لوطی طرزِ فغاں میری
 ٹپکائے شمعِ آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
 سراپا درد ہوں، حسرتِ بکھری ہے داستانِ میری

الہی! پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا؟
 حیاتِ جاوداں میری، نہ مرگِ ناگہاں میری
 مرادِ ناہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
 وہ گل ہوں میں، خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری
 ”دریں حسرتِ سرا عمر لیست افسونِ جیس دارم
 ز فیضِ دلِ طلیہ دنِ باخِ رش بے نفس دارم“
 ریاضِ دہریں نا آشنا لے بزمِ عشرت ہوں
 خوشیِ روتی ہے جس کو، میں وہ محرومِ مسرت ہوں
 مری بگڑی ہوئی، تقدیر کو روتی ہے گویائی
 میں حرفِ زیر لبِ شرمندہ گوشِ سماعت ہوں
 پریشاں ہوں میں مشیتِ خاک، لیکن کچھ نہیں کھلتا
 سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں
 یہ سب کچھ ہے مگر ہستیِ مری مقصد ہے قدرت کا
 سراپا نور ہو جس کی حقیقت، میں وہ ظلمت ہوں
 خزانہ ہوں، چھپایا مجھ کو مشیتِ خاکِ صحرا نے
 کسی کو کیا خبر ہے میں کہاں ہوں، کس کی دولت ہو؟
 نظرِ میری نہیں ممنونِ سیرِ غرضِ ہستی
 میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہو
 نہ صہبا ہوں، نہ ساقی ہوں، نہ ہستی ہوں، نہ ہیما نہ
 میں اس میخانہٗ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں

مجھے رازِ دردِ عالمِ دل کا آئینہ دکھاتا ہے
 وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے
 عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگیں بیانوں میں
 کہ بامِ عرش کے طاثر ہیں میری ہم زبانوں میں
 اثر یہ بھی ہے اک میرے جنونِ فتنہ ساماں کا
 مرا آئینہ دل ہے قصا کے راز دانوں میں
 رلاتا ہے ترانہ ظارہ اے ہندوستان! مجھ کو
 کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
 دیارِ دنا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
 لکھا کلاکِ ازل نے مجھ کو تیرے نومِ خوانوں میں
 نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑا اس باغ میں گلچیں!
 تیری قسمت سے رزمِ آرائیاں ہیں باغبانوں میں
 چھپا کر آستین میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
 غناؤںِ باغ کے غافل نے بیٹھیں آشیانوں میں
 سن اے غافلِ صدامیری! یہ ایسی چیز ہے جس کو
 وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طاثرِ بوستانوں میں
 وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
 تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
 فرادیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے
 دھڑاکیا ہے بتلا عہدِ کہن کی داستانوں میں

یہ خاموشی کہاں تک بہ لذتِ فریاد پیدا کر!
 زمیں پر تو ہو، اور تیری صدا ہو آسمانوں میں!
 نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستانِ والو!
 تمہاری داستانِ تگ بھی نہ ہو گی داستانوں میں
 یہی آئینِ قارت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے
 جو ہے راہِ عمل میں گامزن، محبوبِ فطرت ہے
 ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کر کے چھوڑ دوں گا
 ہو رور کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑ دوں گا
 جلا نا ہے مجھے ہر شمعِ دل کو سوزِ پنہاں سے
 تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑ دوں گا
 مگر غنچوں کی صورت ہوں دلِ درد آشنا پیدا
 چمن میں مشقتِ خاک اپنی پریشان کر کے چھوڑ دوں گا
 پرونا ایک ہی تیسع میں ان بکھرے دانوں کو
 جو مشکل ہے، تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑ دوں گا
 مجھے اے ہم نشین! رہنے دے شغلِ سینہ کا دی میں
 کہ میں داغِ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑ دوں گا
 دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
 تجھے بھی صورتِ آئینہ حیراں کر کے چھوڑ دوں گا
 جو ہے پر وہیں پنہاں چشمِ بینا دیکھ لیتی ہے
 زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے

کیا رفعت کی لذت سے نہ دل کو آشنا تو نے
 گزاری عمر بستی میں مشاٰلِ نقش پا تو نے
 رہا دل بستہ محفل، مگر اپنی نگاہوں کو
 کیا بیرون محفل سے نہ حیرت آشنا تو نے
 خدا کر تار ہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر
 مگر دیکھی نہ اس آئینے میں اپنی ادا تو نے
 تعصب چھوڑ ناداں! دہر کے آئینہ خانے میں
 یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے بُرا تو نے
 سراپا نالہ بیدادِ سوزِ زندگی ہو جا!
 سپند آسا گرہ میں باند رکھی ہے صدا تو نے
 صفائے دل کو کیا آرائشِ رنگِ تعلق سے
 کہت آئینہ پر باندھی ہے ادنا داں! خدا تو نے
 زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پر روتا ہے
 غضب ہے سطر قرآن کو چلیپا کر دیا تو نے!
 زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل!
 بنایا ہے بتِ پندار کو اپنا خدا تو نے
 کنوئیں میں تو نے یوسف کو جو دیکھا بھی تو کیا دیکھا
 ارے خافل! جو مطلق تھا مقید کر دیا تو نے
 ہوس بالائے منبر ہے تجھے رنگیں بیانی کی
 نصیحت بھی تری صورت ہے اک افسانہ خوانی کی

دکھا وہ حسنِ عالم سوز اپنی چشم پر نم کو
 جو تڑپاتا ہے پردانے کو، رلوتا ہے شبنم کو
 نرا نظارہ ہی اے بوالہوس! مقصد نہیں اسکا
 بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشمِ آدم کو
 اگر دیکھا بھی اس نے سارے عالم کو کیا دیکھا
 نظر آئی نہ کچھ اپنی حقیقتِ جام سے جم کو
 شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
 یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلوا تلے آدم کو
 نہ اٹھا جذبہ خورشید سے اک برگِ گل تک بھی
 یہ رفعت کی تمنائے کئے اڑتی ہے شبنم کو
 پھر کرتے نہیں مجروحِ الفت فکرِ درماں میں
 یہ زخمی آپ کر لیتے ہیں پیدا اپنے مرہم کو
 محبت کے شر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
 ذرا سیج پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے
 دواہر دکھ کی ہے مجروحِ تیغِ آرزو رہنا
 علاجِ زخم ہے آزادِ احسانِ رفو رہنا
 شراب بے خودی سے تانلک پر داز ہے میری
 شکستِ رنگ سے سیکھا ہے میں نے بن کے بورہنا
 تھمے کیا دیدہ گریاں وطن کی فوجِ خوانی میں
 عبادتِ چشمِ شاعر کی ہے ہر دم بادِ نورہنا

بنائیں کیا سمجھ کر شاخ گل پر آشیاں اپنا
 چمن میں آہ! کیا رہنا جو ہو بے آب و درہنا
 جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
 غلامی ہے اسیر امتیازِ ما و تو رہنا
 یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھنا ہے ساغر کو
 تجھے بھی چاہیے مثلِ حساب آبِ بحر رہنا
 نہ رہ اپنوں سے بے پردا اسی میں خیر ہے تیری
 اگر منظور ہے دنیا میں اد بیگانہ خواہ رہنا
 شرابِ روح پر در ہے محبت نورِ انساں کی
 سکھایا اس نے تجھ کو مست بے جام و سبور رہنا
 محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
 کیا ہے اپنے بختِ خفّہ کو بیمار قوموں نے
 بیا بانِ محبت دشتِ غربت بھی، وطن بھی ہے
 یہ دیرانہ قفس بھی، آشیاں بھی، چمن بھی ہے
 محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے، صحرا بھی
 جرم بھی، کار داں بھی، راہر بھی، راہزن بھی ہے
 مرض کہتے ہیں سب اس کو، یہ ہے لیکن مرضِ ایسا
 چھپا جس میں علاجِ گردشِ چرخِ کمن بھی ہے

جلانا دل کا ہے گویا سراپا نور ہو جانا
یہ پردانہ جو سوزاں ہو تو شمعِ انجمن بھی ہے
وہی اک حسن ہے، لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں
یہ شیریں بھی ہے گویا، بیستوں بھی، کوہن بھی ہے
اُجاڑا ہے تمیزِ ملت وائیں نے قوموں کو
مرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے؟
سکوتِ آموزِ طولِ داستانِ درد ہے، ورنہ
نہ باں بھی ہے ہمارے منہ میں ادبِ نابِ سخن بھی ہے
”نمی گر دید کو تہ رشتہ معنی رہا کر دم
حکایت بود بے پایاں، بخاموشی ادا کر دم“

ناله فراق (د آرنلڈ کی یاد میں)

جا بسا مغرب میں آخرائے مکاں تیرا کہیں آہ! مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمین
آگیا آج اس صداقت کا مرے دل کو یقین ظلمتِ شب سے ضیائے روزِ فرقت کم نہیں
”تاز آغوشِ وداعش داغِ حیرت چیدہ است
ہمچو شمعِ کشتہ درچشمِ نگہ خوابیدہ است“
کشتہ عزلت ہوں، آبادی میں گہرا ہوں میں شہر سے سودا کی شدت میں نکل جاتا ہوں میں
یادِ ایامِ سلف سے دل کو ٹپاتا ہوں میں بہرِ تسکین تیری جانب و دُڑتا ہوں میں

آنکھ گو مانوس ہے تیرے درد دیوار سے

اجنبیت ہے مگر پیدا مری رفتار سے

ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا آئینہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا

نخل میری آرزوؤں کا ہرا ہونے کو تھا آہ کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونے کو تھا!

ابر رحمت دامن از گلزارِ من برچید و رفت

اند کے برغنجہ ہائے آرزو بارید و رفت

تو کہاں ہے اے کلیمِ دردہ سینائے علم! تھی تری موجِ نفس با دنشاطِ افزائے علم

اب کہاں وہ شوقِ رہِ پیمائیِ صحرائے علم تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

”شورِ لیلیٰ کو کہ باز آرائشِ سودا کند

خاکِ مجنوں را غبارِ خاطرِ صحرَا کند“

کھول دیگا دستِ وحشت عقدہٗ تقدیر کو توڑ کرے پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

دیکھتا ہے دیدہٗ حیراں تری تصویر کو کیا تسلی ہو مگر گر دیدہٗ فقرِ بر کو؟

”تابِ گویائی نہیں رکھتا دہنِ تصویر کا

خامشی کہتے ہیں جس کو ہے سخنِ تصویر کا“

چاند

میرے دیرانے سے کوسوں دور ہے تیرا دطن

ہے مگر دریائے دل تیری کشش سے موجزن

قصہ کس محفل کا ہے؟ آتا ہے کس محفل سے تو؟

زرد و شاید ہوا رنجِ رہِ منزل سے تو؟

آفریش میں سراپا نور تو، ظلمت ہوں میں
 اس سید روزی پہ لیکن تیرا ہم قسمت ہوں میں
 آہ! میں جلتا ہوں سوزِ اشتیاقِ دید سے
 تو سراپا سوزِ داغِ منبتِ خورشید سے
 ایک حلقے پر اگر قائم تری رفتار ہے
 میری گردش بھی مثالِ گردش پر کار ہے
 زندگی کی رہ میں سرگرداں ہے تو، حیراں ہوں میں
 تو فردزاں محفلِ ہستی میں ہے، سوزاں ہوں میں
 میں رہ منزل میں ہوں، تو بھی رہ منزل میں ہے
 تیری محفل میں جو خاموشی ہے، میرے دل میں ہے
 تو طلبِ نحو ہے، تو میرا بھی یہی دستور ہے
 چاندنی ہے نور تیرا، عشق میرا نور ہے
 انجمن ہے ایک میری بھی جہاں رہتا ہوں میں
 بزم میں اپنی اگر یکتہ ہے تو، تنہا ہوں میں
 مہر کا پر تو ترے حق میں ہے پیغامِ اجل
 محو کر دیتا ہے مجھ کو جلوہ حسنِ ازل
 پھر بھی اے ماہِ مبیں! میں اور ہوں تو اور ہے
 درد جس پہلو سے اٹھتا ہو وہ پہلو اور ہے
 گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں، سراپا نور تو
 سیکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو

جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے، جہیں جس سے تری عروم ہے!

ہلالِ روضہ

چمک اٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا جلش سے تجھ کو اٹھا کر حجاز میں لایا
ہوئی اسی سے ترے غمکدے کی آبادی تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی
وہ آستان نہ چھٹا تجھ سے ایک دم کے لیے کسی کے شوق میں تو نے مزے ستم کے لیے
جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں

نظر تھی صورتِ سلمانؑ او اشناس تری شراب دید سے بڑھتی تھی ادبِ پیاس تری
تجھے نظارے کا مثلِ کلیمؑ سودا تھا ادبِ شِطاقت دیدار کو ترستا تھا
مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا ترے لیے تو یہ صحرا ہی طور تھا گویا
تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرت دید خنک دے کہ پیید و دے نیا سائید
گری وہ برق تری جانِ ناشکیبا پر کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دمنِ مٹی پر
پیش ز شعلہ گرفتند و بردل تو زدند

چہ برقِ جلوہ نجاشاک حاصل تو زدند!

ادلے دید سراپا نیاز تھی تیری! کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
اذاں ازل سے تھے عشق کا ترانہ بنی نماز اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی

خوشادہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا!
خوشادہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا!

سرگزشتِ آدم

سنے کوئی مری غربت کی داستان مجھ سے
لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں
رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجھ کو
لامزاج تغیر پسند کچھ ایسا
نکالا کبھی سے پتھر کی موتوں کو کبھی
کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور پر پہنچا
کبھی صلیب پہ انہوں نے مجھ کو لٹکایا
کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں
سنایا ہند میں آکر سرودِ رتانی
دیباہ ہند نے جس دم مری صدا نہ سنی
بنایا دزدوں کی ترکیب سے کبھی عالم
ہوسے لال کیا سیکڑوں زمینوں کو
سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں
کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر
کیا اسیر شعاعوں کو، برقی مضطر کو
مگر خبر نہ ملی آہ! راز ہستی کی

بھلایا قصہٴ پیمانِ اولیں میں نے
پیاشعور کا جب جامِ آتشیں میں نے
دکھایا اوجِ خیالِ فلک نشیں میں نے
کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے
کبھی بنوں کو بنا یا حرم نشیں میں نے
چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے
کیا فلک کو سفر، چھوڑ زمین میں نے
دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے
پسند کی کبھی یوناں کی سرزمین میں نے
بسایا خطہٴ جاپان و ملکِ چین میں نے
خلافِ معنیٰ تعلیمِ اہلِ دیں میں نے
جہاں میں چھپڑ کے پیکارِ عقل و دین میں نے
اسی خیال میں لائیں گزار دیں میں نے
سکھایا مسئلہٴ گردشِ زمیں میں نے
لگا کے آئینہٴ عقلِ دور میں میں نے
بنادی غیرتِ جنت یہ سرزمین میں نے
کیا خرد سے جہاں کو تہ نگیں میں نے

ہوئی جو چشمِ منظر ہر پرستِ دا آخر
تو پایا خانہٴ دل میں اسے کیس میں نے

ترانہ ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم ارہتلے دل وطن میں
پر بت وہ سب سے اونچا، ہمسایہ آسماں کا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندریاں
اے آپ رو دو گنگا! وہ دن ہیں یا تجھ کو؟
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
یونان و مصر و داسب مٹ گئے جہاں سے
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری

ہم بلبل ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستان ہمارا
اب تک گمر ہے باقی نامِ دشتاں ہمارا
صدیوں رہا ہے دشمنِ دورِ زباں ہمارا

اقبال! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں

معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا!

جگنو

جگنو کی روشنی ہے کا شانہٴ چمن میں
آیا ہے آسمان سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا؟
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں؟
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں؟
غربت میں آکے چمکا، گمنام تھا وطن میں؟

نیکہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا؟ ذرہ ہے یا نمایاں سورج کی پہرین میں؟
 حسنِ فایم کی یہ پوشیدہ اک جھلک تھی لے آئی جس کو قدرت خلوتِ انجمن میں؟
 چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی نکلا کبھی گہن سے، آیا کبھی گہن میں

پردانہ اک پننگا، جگنو بھی اک پننگا

وہ روشنی کا طالب، یہ روشنی سراپا

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی پردانے کو پیش دی، جگنو کو روشنی دی
 رنگیں نوا بنایا مرغانِ بے زباں کو گل کو زبان دے کر تعلیمِ خاموشی دی
 نظارہٴ شفق کی خوبی زوال میں تھی چمکا کے اس ہمراہ کو تھوڑی سی زندگی دی
 رنگیں کیا سحر کو، بانگی دلہن کی صورت پہنا کے لال جوڑا شبنم کی آرسی دی
 سایہ دیا شجر کو، پرداز دی ہوا کو پانی کو دی روانی، موجوں کو بے کلی دی

یہ امتیاز لیکن اک — بات ہے ہماری

جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے انساں میں وہ سخن ہے، غنچے میں وہ چٹک ہے
 یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا دیاں چاندنی ہے جو کچھ، یاں درد کی کسک ہے
 اندازِ گفتگو نے دھوکے دیے ہیں، ورنہ نغمہ ہے بولے ببل، بولپھول کی چہک ہے
 کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی جگنو میں جو چمک ہے، وہ پھول میں نہک ہے

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو؟

ہر شے میں جب کہ پنہاں خاموشی ازل ہو

صبح کا ستارہ

لطفِ ہماں کی شمس و قمر کو چھوڑوں اور اس خدمتِ پیغامِ سحر کو چھوڑوں
میرے حق میں تو نہیں تاروں کی بستی اچھی اس بلندی سے زمیں والوں کی بستی اچھی
آسمان کیا، غامِ آباد وطن ہے میرا صبح کا دامنِ صد چاک کفن ہے میرا
میری قسمت میں ہے ہر روز کا مرنا جیسا ساقی موت کے ہاتھوں سے صبوحی پینا
نہ یہ خدمت، نہ یہ عزت، نہ یہ رفعت اچھی اس گھڑی بھر کے چمکنے سے تو ظلمت اچھی

میری قدرت میں جو ہوتا، تو نہ اختر بنتا

قعر دریا میں چمکتا ہوا گوہر بنتا

واں بھی موجوں کی کٹکٹ سیجی دل گھبراتا چھوڑ کر بھر، کہیں زریبِ گلو ہو جاتا
ہے چمکنے میں مزاحسن کا زیور بن کر زینتِ تاجِ سربانوئے قیصر بن کر
ایک پتھر کے جو ٹکڑے کا نصیب اجاگا خاتمِ دستِ سلیمان کا نگین بن کر رہا
ایسی چیزوں کا مگر دہریں ہے کام شکست ہے گہر ہائے گرانمایہ کا انجام شکست
زندگیا وہ ہے کہ جو ہونہ شناسائے اجل کیا وہ جینا ہے کہ جو جس میں نقاضائے اجل

ہے یہ انجام اگر زینتِ عالم ہو کر

کیوں نہ گر جاؤں کسی پھول پہ شبنم ہو کر؟

کسی پیشانی کے افشائے ستاروں میں رہوں کسی مظلوم کی آہوں کے شراردوں میں رہوں
اشکِ بنِ کدِ برشراں سے الگ جاؤں میں کیوں اس میوی کی آنکھوں سے ٹپک جاؤں میں
جس کا شوہر ہو رواں، ہو کے زرہ میں مستور سوئے میدانِ دغا، حبِ وطن سے مجبور

یاس و امید کا نظارہ جو دکھلاتی ہو جس کی خاموشی سے تقریر بھی شرارتی ہو
 جس کو شوہر کی رضا تاب شکیبائی دے اور نگاہوں کو جیا طاقت گویائی دے
 زرد خست کی گھڑی عارض گلوں ہو جائے کشش حسن غم ہجر سے افزوں ہو جائے
 لاکھ وہ ضبط کرے پر میں طپک ہی جاؤں ساغر دیدہ پر غم سے چھلک ہی جاؤں

خاک میں مل کے حیاتِ ابدی پا جاؤں

عشق کا سوز زمانے کو دکھاتا جاؤں

ہندستانی بچوں کا قومی گیت

چشتیؒ نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا نانک نے جس چین میں وحدت کا گیت گایا
 تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا جس نے جاناڑوں سے دشتِ عرب چھڑایا
 میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا سارے جہاں کو جس نے علم دہن دیا تھا
 مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا ترکوں کا جس نے دامنِ مہر دس بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

ٹوٹے تھے جو سنارے فارس کے آسمان سے پہر تاب دیکھے جس نے چمکائے کھلناں سے
 وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

بندے کلیم جس کے، پر بت جہاں کے سینا نورِ نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینا
 رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینا جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

نیا سوال

سچ کہہ دوں اے برہمن اگر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کردوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا دعا کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر دھرم کو چھوڑا
واعظ کا دعظ چھوڑا، چھوڑے ترے نسلے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ دطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ، غیریت کے پردے اک بار کھراٹھا دیں
پچھڑوں کو کپھر ملا دیں، نفثِ دوئی مٹا دیں
سوئی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ، اک نیا سوال اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے ادنچا ہوا اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ بیٹھے بیٹھے
سارے پجاریوں کو مے پریت کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

داع

عظمتِ غالبیہ اک مدت پیوندِ زمیں
توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینے امیر
مہدی مجروح ہے شہرِ خوشاں کا لکس
چشمِ محفل میں ہر ابناک کیف صہبائے امیر
آج لیکن ہنوا! سارا چمن ماتم میں ہے!
شیعہ روشن بجھ گئی، بزمِ سخن ماتم میں ہے!
بلبلِ دلی نے باندھا اس چمن میں آشیاں
ہمنوا ہیں سب عنادل باغِ ہستی کے جہاں

چل بسا داغ آہ! میت اس کی زیبہ دوش ہے!

آخری شاعرِ جہان آباد کا خاموش ہے!

اب کہاں وہ بانگین! وہ شوخی طرزِ بیاں! آگ تھی کا فیر پیری میں جوانی کی نہاں

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو در دل میں ہے بلی معنی وہاں بے پردہ، یاں محل میں ہے

اب صبا سے کون پوچھے گا سکون گل کا راز؟ کون سمجھے گا چین میں نالہ بلبلی کا راز؟

تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں

آنکھ طائر کی نشین پر رہی پرواز میں

اور دکھلائیں گے مغنوں کی ہمیں باریکیاں اپنے فکرِ نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں

تلخی دوراں کے نقشے کیسے کر لوائیں گے یا تخیل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائیں گے

اس چن میں ہوں گے پیرا بلبلی شیرازہ بھی سیکڑوں ساحر بھی ہوں گے، متنازعہ بھی

اٹھیں گے آرزو داروں، شرکے پتخانے سے مے پلائیں گے نئے ساتی نئے پرانے سے

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت ہوں گی اے خوابِ جوانی! تیری تعبیریں بہت

ہو جو کیسے بچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟

اٹھ گیا ناوکِ فلک، مارے گا دل پر تیر کون؟

اسکے دانے زمینِ شعر میں بونا ہوں میں تو بھی روئے خاکِ دلی! داغ کو رونا ہوں میں

اے جہان آباد اے سرمایہ بزمِ سخن! ہو گیا پھر آج پامال خزاں تیرا چمن!

وہ گل رنگین ترارِ رخصت مثالِ بو ہوا آہ! غالی داغ سے کاشانہ اردو ہوا

تھی نہ شاید کچھ کشش ایسی وطن کی خاک میں وہ مہِ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں

اٹھ گئے ساتی جو تھے، بیخانہ خالی رہ گیا

یادِ گارِ بزمِ دہلی ایک حالی رہ گیا

آرزو کو خون روائی ہے بیدارِ اجل مارتا ہے تیر تار کی میں صیادِ اجل
 کھل نہیں سکتی شکایت کے لیے لیکن زبان ہے خزاں کا رنگ بھی وجہ قیامِ گلستاں
 ایک ہی قانونِ عالم گیر کے ہیں سب اثر
 بوے گل کا باغ سے گلچیں کا دنیا سے سفر

ایمر

اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سر پہن کا
 نہاں ہوا جو رخِ مہر زبرد اس میں ابر ہوائے سرد بھی آئی سوارِ نوسن ابر
 گرچ کا شور نہیں ہے، خوش ہے یہ گھٹا عجیب میکہ بے خروش ہے یہ گھٹا
 چمن میں حکمِ نشاطِ مدام لائی ہے قبائے گل میں گہر ٹانگنے کو آئی ہے
 جو پھول مہر کی گرمی سے سوچے تھے، اٹھے زمیں کی گود میں جو پڑے سورہے تھے، اٹھے
 ہولے زرد سے ابھرا، بڑھا، اڑا بادل اٹھی وہ اور گھٹا، لو! برس پڑا بادل

عجیب خیمہ ہے کہسار کے نہالوں کا !

یہیں قیام ہو دادی میں پھرنے والوں کا

ایک پرندہ اور جگنو

سیر شام ایک مرغِ نغمہ پیرا کسی ٹہنی پہ بیٹھا گارہا تھا
 چمکتی چیز اک دیکھی زمیں پر اڑا اڑا اسے جگنو سمجھ کر
 کہا جگنو نے اور مرغِ نوا ریز نہ کرے کس پہ منقار ہو س تیز

تجھے جس نے چمک اگل کو مہک دی اسی اللہ نے مجھ کو چمک دی
 لباس نور میں مستور ہوں میں پتنگوں کے جہاں کا طور ہوں میں
 چمک تیری بہشت گورنہ اگر ہے چمک میری بھی فردوس نظر ہے
 پروں کو میرے قدرت نے ضیاء دی تجھے اس نے صداے دلربا دی
 تری منتقار کو گانا سکھایا تجھے گلزار کی مشعل بنایا
 چمک بخشی تجھے آواز تجھ کو دیلے سوز مجھ کو، ساز تجھ کو
 مخالف ساز کا ہونا نہیں سوز جہاں میں ساز کا ہے ہم نشیں سوز
 قیام بزم ہستی ہے انھیں سے ظہور اوج دلپستی ہے انھیں سے

ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی
 اسی سے ہے بہار اس بوستان کی

چمچہ اور شمع

کیسی حیرانی ہے یہ لے طذالک پر دانہ خو ! شمع کے شعلوں کو گھڑیوں دیکھتا رہتا ہر تو
 یدری آغوش میں بیٹھ ہوئے جنبش ہے کیا روشنی سے کیا بغل گیری ہے تیرا مدعا ؟

اس نظارے سے ترانہ سادہ دل حیران ہے
 یہ کسی دیکھی ہوئی شے کی مگر پہچان ہے !

شمع اک شعلہ ہے، لیکن تیرا نور ہے آہ ! اس محفل میں یہ عریاں ہے تو مستور ہے
 دست قدرت نے اسے کیا جانے کیوں عریاں کیا ! تجھ کو خاک تیرہ کے فانوس میں پہنا کیا
 نور تیرا چھپ گیا زبر نقاب آگہی ! ہے غبار دیدہ بینا حجاب آگہی !

زندگانی جس کو کھتے ہیں فراموشی ہے یہ

خواب ہے، غفلت ہے، مستی ہے، بیہوشی ہے یہ

مخملِ قدرت اک دریاے بے پایاں حسن
حسن کو ہمتاں کی ہیبت ناک خاموشی میں ہے
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حسن
مہر کی نگوکتری، شب کی سیہ پوشی میں ہے
آسمان صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ
شام کی ظلمت، شفق کی گلِ فروشی میں ہے یہ
عقلمند دیرینہ کے مٹے ہوئے آثار میں
طفلکِ نا آشنا کی کوششِ گفتار میں
ساکنانِ صبحِ گلشن کی ہم آدازی میں ہے
نہنے نہنے طائروں کی آشیاں ساندی میں ہے
چشمہ کہسار میں، دریا کی آزادی میں حسن
شہر میں، محراب میں، دیلے میں، آبادی میں حسن
روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس
در نہ اس محراب کیوں نالاں ہے ینشِ حرس؟

حسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ بیتاب ہے

زندگی اس کی مثالِ ماہی بے آب ہے

کنارِ راوی

سکوتِ شام میں محوِ سرود ہے راوی
نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیتِ مرے دل کی
پیامِ سجدہ کا یہ زیر و بم ہوا مجھ کو
جہاں تمام سوادِ حرم ہوا مجھ کو

سرکنسارہ آبِ رواں کھڑا ہوں میں

خبر نہیں مجھے لیکن کہاں کھڑا ہوں میں

شرابِ سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامنِ شام
یہ ہے ہیرِ فلک دستِ رعشا دارینِ جام
عدم کو قافلہ روز تیز گام چلا
شفق نہیں ہے، یسورج کے پھول ہیں گویا!

کھڑے ہیں دور وہ عظمت فرائے تنہائی منارِ خواب گر شہسوار چغتائی
فسانہ سستم انقلاب ہے یہ محل کوئی زمانِ سلف کی کتاب ہے یہ محل
مقام کیا ہے، سرودِ خموش ہے گویا
شجرہ یہ انجمن بے خروش ہے گویا!

رواں ہے سینہ دریا پہ اک سفینہ تیز ہوا ہے موج سے ملا جس کا گرم ستیز
سبک روی میں ہے مثلِ نگاہ یہ کشتی نکل کے حلقہ مدّ نظر سے دور گئی
جہازِ زندگی آدمی رواں ہے یونہیں ابد کے بحر میں پیدا یونہیں نہاں ہے یونہیں
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے، لیکن فنا نہیں ہوتا

الحیّ المسافر
(بہ درگاہِ حضرت محبوبِ الہی، دہلی)

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا بڑی جناب تیری، فیض عام ہے تیرا
ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم نظامِ مہر کی صورت نظام ہے تیرا
تیری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا
نہاں ہے تیری محبت میں رنگِ محبوبی بڑی ہے شان، بڑا احترام ہے تیرا

اگر سیاہ دلم، داغِ لالہ زار توام
وگر کشادہ جبینم، گلِ بہار توام
چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثلِ نکبتِ گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحان مجھ کو

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
نظر ہے ابر کرم پر، درختِ صحرا ہوں
فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں
مقام ہم سفر وں سے ہو اس قدر آگے
مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر
بنایا تھا جسے چن چن کے خار و خس میں نے
پھر آ رکھوں قدمِ مادر و پدر پہ جیس
وہ شمعِ بارگہ خاندانِ مرتضوی
نفس سے جس کی کھلی میری آرزو کی کھلی
دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں
وہ میرا یوسفِ ثانی، وہ شمعِ محفلِ عشق
جلال کے جس کی محبت نے دفترِ من و تو
ریاضِ دہریں مانند گل رہے خداں
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
کیا خدا نے نہ محتاجِ باغباں مجھ کو
تری دعا سے عطا ہو وہ نردیاں مجھ کو
کہ سمجھے منزلِ مقصود کا رداں مجھ کو
کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو
تری جناب سے ایسی طے فضاں مجھ کو
چمن میں پھر نظر آئے وہ آشیاں مجھ کو
کیا جنھوں نے محبت کا راز داں مجھ کو
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستان مجھ کو
بنایا جس کی مقرر نے نکتہ داں مجھ کو
کرے پھر اس کی زیارت سے شاداں مجھ کو
ہوئی ہے جس کی انھوت قرارِ جاں مجھ کو
ہوئے عیش میں پالا، کیا جواں مجھ کو
کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جاںِ جاں مجھ کو
شگفتہ ہو کے کھلی دل کی پھولی ہو جائے!
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے!

غزلیات

گلزارِ بہشت و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

آیا ہے تو جہاں میں مثالِ شرار دیکھ دم دے نہ جائے ہستی ناپایدار دیکھ
 مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں تو میرا شوق دیکھ ، مرا انتظار دیکھ
 کھولی ہیں ذوقِ دید نے آنکھیں تری اگر
 ہر رگِ زریں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ

... ❖ ...

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی مگر وعدہ کرتے ہوئے خار کیا تھی
 تمہارے پیامی نے سب راز کھولا خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
 بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا تری آنکھِ مستی میں ہشیار کیا تھی
 تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی
 کھینچے خود بخود جانبِ طور و شہنی کشش تیری اے شوقِ دیدار کیا تھی!

کہیں ذکر رہتا ہے اقبالِ تیرا
 فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

.... ❖

عجب داعظ کی دینداری ہے یارب ! عداوت ہے اسے سارے جہاں سے
 کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں کہاں جاتا ہے ، آتا ہے کہاں سے ؟
 وہیں سے رات کو ظلمت ملی ہے چمک تارے نے پائی ہے جہاں سے
 ہم اپنی درد مندی کا فسانہ سنا کرتے ہیں اپنے رازِ داں سے

بڑی باریک ہیں داعظ کی چالیں

لرز جاتا ہے آوازِ اذیاں سے !

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
 یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں
 علاج درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں
 جو تھے پھالوں میں کانٹے ٹوک سوزن سے نکالے ہیں
 ✓ پھلا پھولا ہے یارب جن میری امیدوں کا
 جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں
 رات ہی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی
 نرالا عشق ہے میرا، نرالے میرے نالے ہیں
 نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی
 نشیمن سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں
 نہیں بیگانگی اچھی رفیق راہ منزل سے
 ٹھہر جاے شرہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں
 امید حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
 یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں
 مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
 مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ درد انگیز نالے ہیں

.....

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی ہو دیکھنا تو دیدہ دل دا کرے کوئی
 منصور کو ہوا لب گویا پیام موت اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بن کر
میں انتہائے عشق ہوں، تو انتہائے حسن
عذر آفرینِ جرمِ محبت ہے حسنِ دوست
چھپتی نہیں ہے یہ نگہ شوق، ہم نشیں!
اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم
نظارے کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی
دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
تختِ میں عذر تازہ نہ پیدا کرے کوئی
پھر اور کس طرح انھیں دیکھا کرے کوئی
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی
کھل جائیں کیا مزے ہیں تمنائے شوق میں
دو چار دن جو میری تمنا کرے کوئی

.....

کہوں کیا آرزوئے بیداری تجھ کو کہا تک ہے
وہ میکش ہوں فروغِ مے سے خود گلزارِ بجاؤں
چمنِ افروز ہے صیادِ میری خوشنوائی تک
وہ مشتِ خاک ہوں فیضِ پریشانی سے صحرا ہوں
جس ہوں، ناخواہیدہ ہے میرے ہر گپے میں
سکونِ دل سے سامانِ کشود کا رپیداکر
چمنِ زارِ محبت میں غموشی موت ہے بلبل
جوانی ہے تو ذوقِ دید بھی، لطفِ تمنا بھی
مرے بازار کی رونق ہی سو دے زیاں تک ہے
ہوئے گلِ فراقِ ساقی، نامہرِ باں تک ہے
رہی بجلی کی بیتابی، سویرے آشیاں تک ہے
نہ پوچھو میری وسعت کی، زمیں سے آسمان تک ہے
یہ خاموشی مری وقتِ رحیل کا رداں تک ہے
کہ عقدہ خاطرِ گرداب کا آپ رداں تک ہے
یہاں کی زندگی پابندی رسمِ فغاں تک ہے
ہمارے گھر کی آبادی قیامِ یہاں تک ہے

زمانے بھر میں رسوا ہوں مگر اے دائے نادانی

سمجھتا ہوں کہ میرا عشق میرے رازداں تک ہے

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں، زمینوں میں
 وہ نکلے میرے ظلمت خانہ دل کے مکینوں میں
 حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی
 مکاں نکلا ہمارے خانہ دل کے مکینوں میں
 اگر کچھ آشنا ہوتا مذاقِ جبہ سائی سے
 تو سنگِ آستانِ کعبہ جا ملتا جبینوں میں
 کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں؟
 کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محلِ نشینوں میں
 مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اٹتے جاتے ہیں
 مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں
 مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے
 کہ جن کو ڈوبنا ہو، ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں
 چھپایا حسن کو اپنے کلیم اللہ سے جس نے
 وہی ناز آفریں ہے جلوہ پیرا نازنینوں میں
 جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی
 الہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں
 تنہا درو دل کی ہو تو کمرِ خدمتِ فقیروں کی
 نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزانوں میں
 نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، الادب ہو تو دیکھ ان کو
 یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

ترستی ہے نگاہِ نارسا جس کے نظارے کو
 وہ رونقِ انجمن کی ہے انہیں خلوتِ گزینوں میں
 کسی ایسے شر سے پھونک اپنے خمینِ دل کو
 کہ خورشیدِ قیامت بھی ہوتیرے خوشہ چینوں میں
 محبت کے لیے دل ڈھونڈے کوئی ٹوٹنے والا
 یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آگینوں میں
 سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق
 بھلا اے دل حبیبی ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں
 پھر تک اٹھا کوئی تیری ادائے ماعدہ فنا پر
 ترارِ تہ رہا بڑھ چڑھ کے سب نازا فرینوں میں
 نمایاں ہو کے دکھلا دے کبھی ان کو جمال اپنا
 بہت مدت سے چرچے ہیں ترے باریک بینوں میں
 خموش اے دل! بھری محفل میں چلا نا نہیں اچھا
 ادب پہلا قربہ ہے محبت کے قربوں میں
 بُرا سمجھوں انہیں؟ غم سے تو ایسا ہونہیں سکتا
 کہ میں خود بھی تو ہوں اقبال اپنے نکتہ چینوں میں

.....

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
 ستم ہو کہ ہو وعدہ بے حجابی کوئی بات صبر آزا چاہتا ہوں

یہ جنت مبارک رہے زہدوں کو کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں
 وراسا تو دل ہوں، مگر شوخ اتنا دی لہن ترانی سنا چاہتا ہوں
 کوئی دم کا سماں ہوں لے اہل محفل چراغِ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں
 بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
 بڑا بے ادب ہوں، سنا چاہتا ہوں

.....

کشاہدہ دستِ کرم جب دہ بے نیاز کرے
 بٹھا کے عرش پر رکھا ہے تو نے اے داعظا!
 مری نگاہ میں وہ رند ہی نہیں ساقی
 دلام گوش بہ دل رہ یہ ساز ہے ایسا
 کوئی یہ پوچھے کہ داعظا کا کیا بگڑتا ہے
 سخن میں سونہر اہلی کہاں سے آتا ہے
 تمیز لالہ و گل سے ہے نالہ لبس
 غرور نہ ہونے سکھلا دیا ہے داعظا کو
 نیاز مند نہ کیوں عاجزی پہ ناز کرے
 خدادہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے
 جو ہوشیاری دستی میں امتیاز کرے
 جو ہوشکستہ تو پیدا نوائے راز کرے
 جو بے عمل پہ بھی رحمت دہ بے نیاز کرے
 یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو بھی گداز کرے
 جہاں میں دانہ کوئی کچشم امتیاز کرے
 کہ بند گانِ خدا پر زباں دراز کرے

ہوا ہو ایسی کہ ہندستان سے اے اقبال
 اڑا کے مجھ کو غبارِ رہ حجاز کرے

.....

سخنیاں کرتا ہوں دل پر، بغیر سے غافل ہوں میں
 ہائے کیا اچھی کہی ظالم ہوں میں، جاہل ہوں میں

میں جمعی تک تھا کہ تیری جلوہ پیرائی نہ تھی
 جو نحو و حق سے مٹ جاتلے وہ باطل ہوں میں
 علم کے دریا سے نکلے غوطہ زن گوہر بدست
 دائے محرومی! خزنِ جبین لب ساحل ہوں میں
 ہے مری ذلت ہی کچھ میری شرافت کی دلیل
 جس کی غفلت کو ملک روتے ہیں وہ غافل ہوں میں
 بزم ہستی! اپنی آرائش پہ تو نازاں نہ ہو
 تو تو اک تصویر ہے محفل کی اور محفل ہوں میں
 ڈھونڈنا پھرنا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو
 آپ ہی گویا مسافر، آپ ہی منزل ہوں میں

..... ❦

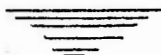
جنوں نے شہر چھوڑا، تو صحرابھی چھوڑ دے
 واعظ! کہا (نرک سے ملتی ہے یاں مراد
 تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خود کشی
 اندر امیر کی زبان پر ہے حرفِ غیر
 لطفِ کلام کیا جو نہ ہو دل میں دردِ عشق
 شبنم کی طائر چھو لوں پہ روا، اور چین سے چل
 ہے عاشقی میں رسم الگ سب سے بیٹھنا
 سیراگرو نہیں، یہ عبادتِ خدا کی ہے !

نظارے کی ہوس ہو تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے
 دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے
 رستہ بھی ڈھونڈ، خضر کا سودا بھی چھوڑ دے
 بیگانہ شے پہ نازش بیجا بھی چھوڑ دے
 بسمل نہیں ہے تو توڑ پھا بھی چھوڑ دے
 اس باغ میں قیام کا سودا بھی چھوڑ دے
 تنہا نہ بھی، حرم بھی، کلیسا بھی چھوڑ دے
 اے بے خبر! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

سوداگری نہیں، یہ عبادت خدا کی ہے ! اے بے خبر! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے
 اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے
 جینا دہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے
 شوخی سی ہے سوالِ مکر میں اے کلیم شرطِ رضایہ ہے کہ تقاضا بھی چھوڑ دے

داغِ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں

اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے



حصہ دوم

(۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک)

محبت

عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا ہم سے
 قرآنے لباسِ نو میں بیگا نہ سا لگتا تھا
 ابھی امکاں کے خامت خانے سے ابھری ہی تھی دنیا
 کمالِ نظم ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
 سنا ہے عالمِ بالا میں کوئی کیمیا گر تھا
 لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اکیر کا نسخہ
 نکا ہیں ناک میں رہتی تھیں لیکن کیمیا گر کی
 بڑھا تسبیحِ خوانی کے بہانے عرش کی جانب
 پھر یا فکرِ اجزانے اسے میدانِ امکاں میں
 چمک تارے سے مائی، چاند سے داغ جگر مانگا
 تڑپ بجلی سے پانی، عوس سے پاکیزگی پائی
 ذرا سی پھر بربیت سے شانِ بے نیازی لی
 پھر ان اجزا کو گھولاجشمہِ حیواں کے پانی میں
 مہوس نے یہ پانی، ہستی نو خیز پر چھڑکا
 ہوئی جنبشِ عیاں، ذروں نے لطفِ خواہ چھڑا

خرام ناز پایا آفتابوں نے، ستاروں نے

چٹک غنچوں نے پانی، داغ پائے لالہ زاروں نے

ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذتِ رم سے
 نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئینِ مسلم سے
 مذاقِ زندگی پوشیدہ تھا پہنلے عالم سے
 ہویدا تھی نگینے کی تمنا چشمِ خاتم سے
 صفا تھی جس کی خاکِ پایاں بڑھ کر ساغرِ جم سے
 چھپاتے تھے خشتے جس کو چشمِ روحِ آدم سے
 وہ اس نسخے کو بڑھ کر جانا تھا اتمِ اعظم سے
 تمنائے دلی آخر برآئی سنی بیہم سے
 چھپے گی کیا کوئی شے بارگاہِ حق کے محرم سے
 اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے
 حرارتِ لی نفسہائے مسیح ابن مریم سے
 ملک سے عاجزی، افتادگی تقدیرِ شبنم سے
 مرکب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے
 گرہ کھولی نہرنے اس کے گویا کارِ عالم سے
 گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمارم سے

حقیقتِ حسن

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دنیا
وہی جس میں ہے حقیقتِ زوال ہے جس کی
فلک پر عام ہوئی، اخترِ سحر نے سنی
فلک کی بات بتا دی زیریں کے محرم کو
سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو
بھرائے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے
کلی کا تنہا سادل خون ہو گیا غم سے

چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا
شبابِ سیر کو آیا تنہا، سو گوار گیا!

پیام

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تیش سے آشنا
شانِ کرم پہ ہے ملا عشقِ گرہ کشائے کا
بزمِ کوثرِ شمعِ بزمِ حاصلِ سوزِ ساز دے
جس کو خدا نہ دہر میں گریہ جا نگہ ساز دے
چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمہ اتنیاز دے
حسن ہے مستِ ناز اگر تو بھی جوابِ ناز دے
اس میں وہ کیفیتِ غم نہیں، بھٹکنا تو فائدہ ساز دے
تجھ کو خبر نہیں ہے کیا؟ بزمِ کہن بدل گئی
اب نہ خدا کے واسطے ان کوئے مجاز دے

سوامی رام تیرتھ

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرہ بے تاب ! تو پہلے گوہر تھا، بنا اب گوہر نایاب تو
 آہ ! کھولا کس ادا سے تو نے راز رنگ و بو میں ابھی تک ہوں اسیر انیاز رنگ و بو
 مرط کے غوغا زندگی کا شورش محشر بنا یہ شرارہ بکھ کے آتش خانہ آذر بنا
 نفی ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا لاکے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا
 چشم نابینا سے مخفی معنی انجام ہے تھم گئی جس دم تڑپ، سیلاب سیم خام ہے
 توڑ دیتا ہے بت ہستی کو ابراہیم عشق
 ہوش کا دار و ہے گویا مستی تسنیم عشق

طلیہ علی گڑھ کالج کے نام

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے عشق کے درد مند کا طرز کلام اور ہے
 طائر زیر دام کے نالے تو سن چکے ہو تم یہ کبھی سنو کہ نالہ طائر بام اور ہے
 آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں کہتا تھا موبر ناتواں لطف خرام اور ہے
 جذبِ حرم سے ہے فروغِ انجمن حجاز کا اس کا مقام اور ہے، اس کا نظام اور ہے
 موت ہے عیش جاوداں، ذوقِ طلب اگر نہ ہو گردش آدمی ہے اور گردش جام اور ہے
 شمعِ سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز نغمہ نمود میں شرطِ دوام اور ہے

بادہ ہے نیم رس ابھی، شوق ہے نار سا ابھی
 رہنے دو غم کے سر پہ نم خشتِ کلیسیا ابھی

اختر صبح

ستارہ صبح کا روتا تھا اور یہ کہتا تھا ملی نگاہ، مگر فرصتِ نظر نہ ملی
ہوئی ہے زندہ دم آفتاب سے ہر شے اماں مجھی کو تو دامنِ سحر نہ ملی

بساط کیا ہے بھلا صبح کے ستارے کی

نفسِ جواب کا، تا بندگیِ شرارے کی

کہا یہ میں نے کہ اے زیورِ جبینِ سحر! غمِ فنا ہے تجھے؟ گنبدِ فلک سے اتر
ٹپک بلندیِ گردوں سے ہم رہِ شبنم مرے ریاضِ سخن کی فضا ہے جاں پرورد

میں باغباں ہوں محبتِ بہار ہے اس کی

بنا مثالِ ابدِ پاکدار ہے اس کی

حسن و عشق

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیِ سمیں قمر نورِ خورشید کے طوفان میں ہنگامِ سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم، نورِ کالے کر آئینل چاندنی رات میں مہتاب کا ہمزگ کنول
جلوہ طور میں جیسے یدِ بزمائے کلیم موجِ نکہتِ نگزار میرا غنچے کی شمیم
ہے ترے سببِ محبت میں یونہیں دل میرا

تو جو محفل ہے، تو ہنرِ گامہ محفل ہوں میں حسن کی برق ہے تو، عشق کا حاصل ہوں میں
تو سحر ہے، تو مرے اشک ہیں شبنم تیری شامِ غربت ہوں اگر میں، تو شفق تو میری
مرے دل میں تری زلفوں کی پریشانی ہے تری تصویر سے پیدا مری حیرانی ہے

حسنِ کامل ہے تیرا، عشق ہے کامل میرا

ہے مرے باغِ سخن کے لیے تو باد بہار
جب سے آباد تر عشق ہوا سینے میں
میرے بیتابِ تنہا کو دیا تو نے قرار
حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریکِ کمال
نئے جو ہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں
تجھ سے سرسبز ہوئے میری امیدوں کے نہال

.... کی گود میں پٹی دیکھ کر تافلہ ہو گیا آسودہ منزل میرا

تجھ کو زردیدہ نگاہی یہ سکھادی کس نے؟
ہر ادا سے تیری پیدا ہے محبت کیسی
رمزِ آغازِ محبت کی بتادی کس نے؟
نیلے آنکھوں سے ٹپکتی ہے ذکارت کیسی
کبھی اٹھتی ہے، کبھی لیٹ کے سو جاتی ہے
نورِ آگاہی سے روشن تری پہچان ہے کیا؟
چڑھ ہے یا غم ہے؟ یا پیار کا انداز ہے؟
گر گیا پھول جو سینے کا تو ماریں گے تجھے
آہ! کیا تو بھی اسی چیز کی سودائی ہے؟
صورتِ دل ہے یہ ہر چیز کے باطن میں لکھیں
روحِ خورشید ہے، خونِ رگ ہوتا ہے عشق
نور یہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلکے اس کی
تجھ کو زردیدہ نگاہی یہ سکھادی کس نے؟
ہر ادا سے تیری پیدا ہے محبت کیسی
دیکھتی ہے کبھی ان کو، کبھی شرماتی ہے
آنکھ تیری صفتِ آنسو حیران ہے کیا؟
مارتی ہے انہیں پنہجوں سے عجب نانہ ہے یہ!
شوخی تو ہوگی، تو گودی سے اتاریں گے تجھے
کیا تجسس ہے تجھے؟ کس کی تمنائی ہے؟
خاص انسان سے کچھ حسن کا احساس نہیں
شیشہ دہریں مانند ہے ناب ہے عشق
دلِ ہرزہ میں پوشیدہ کسک ہے اس کی

کہیں سامانِ مسرت، کہیں سازِ غم ہے
کہیں گوہر ہے، کہیں اشک، کہیں شبنم ہے

کلی

جب دکھاتی ہے سحر عارض رنگیں اپنا کھول دیتی ہے کلی سینہ زریں اپنا
جلوہ آشام ہے یہ صبح کے میخانے میں زندگی اس کی ہے خورشید کے پیمانے میں

سامنے مہر کے دل چیر کے رکھ دیتی ہے
کس قدر سینہ شگافی کے مزے لیتی ہے

مرے خورشید! کبھی تو کبھی اٹھا اپنی نقاب بہرِ نظارہ تڑپتی ہے نگاہِ بیتاب
تیرے جلوہ کا نشیمن ہو مرے سینے میں عکس آباد ہو تیرا مرے آئینے میں
زندگی ہو ترا نظارہ مرے دل کے لیے روشنی ہو تیری گہوارہ مرے دل کے لیے
ذرہ ذرہ ہو مرا پھر طرب اندوزِ حیات ہو عیاں جو ہر اندیشہ میں پھر سوزِ حیات
اپنے خورشید کا نظارہ کر دوں دوسرے میں صفتِ غنچہ ہم آغوش رہوں نور سے میں

جانِ مضطر کی حقیقت کو نمایاں کر دوں
دل کے پوشیدہ خیالوں کو کبھی عیاں کر دوں

چاند اور تارے

ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے تارے کہنے لگے قمر سے
نظارے رہے وہی فلک پر ہم تھکا بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا چلنا، چلنا، ملام چلنا
بیتاب ہے اس جہاں کی ہر شے کہتے ہیں جسے سکون نہیں ہے

رہتے ہیں ستم کش سفر سب تارے، انساں، شجر، حجر، سب

ہو گا کبھی ختم یہ سفر کیا؟

منزل کبھی آئے گی نظر کیا؟

کہنے لگا چاند، ہم نشینو! اے مزرع شب کے خوشہ چینو!

جنش سے ہے زندگی جہاں کی یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

ہے دوطرنا شہب زمانہ کھا کھا کے طلب کا تازیانہ

اس رہ میں مقام بے محل ہے پوشیدہ قرار میں اجل ہے

چلنے والے نکل گئے ہیں! جو ٹھہرے ذرا، کچل گئے ہیں

انجام ہے اس فراق کا حسن

آغاز ہے عشق، انتہا حسن

وصال

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے خوبی قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے

خود تڑپتا تھا، چمن دالوں کو تڑپاتا تھا میں تجھ کو جب رنگیں نوا پاتا تھا، شرابا تھا میں

میرے پہلو میں دل مضطر نہ تھا، سیلاب تھا از نکاب جرم الفت کے لیے بے تاب تھا

نامرادی محفل گل میں مری مشہور تھی صبح میری آئینہ دار شب دیجور تھی

از نفس در سینہ خوں گشتہ نشتر داشتتم

زیر خاموشی نہاں غوغائے محشر داشتتم

اب تاثر کے جہاں میں وہ پریشانی نہیں اہل گلشن پر گراں میری غزلخوانی نہیں

عشق کی گرمی سے شعلے بن گئے چھالے مرے
 غارہ الفت سے یہ خاکِ سیہ آئینہ ہے
 کھیلنے ہیں بجلیوں کے ساتھ اب نالے مرے
 اور آئینے میں عکس ہمارم دبیرینہ ہے
 دل کے لٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی
 قید میں آیا تو حاصلِ مجھ کو آزادی ہوئی
 چاندنی جس کے غبارِ راہ سے شرمندہ ہے
 صنو سے اس خورشید کی اختر مرانا بندہ ہے

ایک نظر کر دی واداد فنا آموختی
 اے خنکارِ دوزے کہ فاشاکِ مراد آموختی

سلیمی

جس کی نمود دیکھی چشمِ ستارہ میں نے
 خورشید میں، قمر میں، تاروں کی انجمن میں
 صوفی نے جس کو دل کے ظلمت کدہ میں پایا
 شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانگین میں
 جس کی چمک ہے پیدا، جس کی مہک ہویدا
 شبِ نیم کے موتیوں میں، پتھروں کے پیرہن میں
 صحرائے بسایا جس نے سکوت بن کر
 ہنگامہ جس کے دم سے کاشانہ چمن میں

ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا!
 آنکھوں میں ہے سلیمی! تیری کمال اس کا!

عاشق ہرجائی

(۱)

ہے عجب مجموعہ افسردہ اقبال! تو
تیرے ہنگاموں سے اے دیوانہ رنگیں نوا!
ہم نشیں تاروں کا ہے تورفت پر دار سے
عین شغلِ مے میں پیشانی ہے تیری سجدہ ریز
مثل بوئے گل لباس رنگ سے عریاں ہے تو
جانبِ نزلِ رواں بے نقش پا مانند موج
حسن نسوانی ہے: بجلی تیری فطرت کے لیے
تیری ہستی کا ہے آئینِ تفتن پر مدار
ہے حسینوں میں دفانا آشنا تیرا خطاب

روقت ہنگامہ محفل بھی ہے، تنہا بھی ہے
زینتِ گلشن بھی ہے، آرائشِ صحرا بھی ہے
اے زمیں فرسا قدم تیرا فلک پیمایا بھی ہے
کچھ ترے مسلک میں رنگِ شربِ مینا بھی ہے
ہے تو حکمتِ آفریں، لیکن تجھے سودا بھی ہے
اور پھر افتادہ مثل ساحلِ دریا بھی ہے
پھر عجب یہ ہے کہ تیرا عشق بے پردا بھی ہے
تو کبھی ایک آستانے پر جس میں فرسا بھی ہے
اے تلون کیش! تو مشہور کبھی، رسوا بھی ہے

لے کے آیا ہے جہاں میں عادتِ سیما ہے تو
تیری بینائی کے صدمے، ہے عجب بیتاب تو

(۲)

عشق کی آشفستگی نے کر دیا صحرا جسے
ہیں ہزاروں اسکے پہلو، رنگ ہر پہلو کا اور
دل نہیں شاعر کا، ہے کیفیتوں کی رستخیز
آرزوہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے

مشتِ خاک الہی نہاں زیرِ قبا رکھنا ہوں میں
سینے میں ہیرا کوئی ترشا ہوا رکھنا ہوں میں
کیا خبر تجھ کو، درونِ سینہ کیا رکھنا ہوں میں
مضطرب ہوں، دل سکوں نا آشنا رکھنا ہوں میں

گو حسین تازہ ہے ہر لحظہ مقصودِ نظر
بے نیازی سے ہے پیدا میری فطرت کا نیاز
موجب تسکین تما شا کے شرارِ جستہ
ہر تقاضا عشق کی فطرت کا ہر جس سے خوش
جستجو کل کی لیے پھرتی ہے اجزایں مجھے
زندگی الفت کی دردِ انجا میوں سے ہے مری
سچ اگر بوجھے تو افلاسِ تخیل ہے وفا
فیضِ ساقی شبنم آسا، ظرفِ دلِ دریا طلب
مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
محفلِ ہستی میں جب ایسا تک جلوہ تھا حسن

حسن سے مضبوط پیمان و فارِ کھنا ہوں میں
سوز و سازِ جستجو مثلِ صبارِ کھنا ہوں میں
ہنرمیں سکتا کہ دلِ برق آشنا کھنا ہوں میں
آہ! وہ کامل تجلی مدعا کھنا ہوں میں
حسن بے پایاں ہے درجہِ لادار کھنا ہوں میں
عشق کو آزاد و ستور و فارِ کھنا ہوں میں
دل میں ہر دم اک نیا محشرِ بار کھنا ہوں میں
تشنہ دائم ہوں، آتشِ زیرِ بار کھنا ہوں میں
نقشِ ہوں، اپنے مصور سے گار کھنا ہوں میں
پھر تخیل کس لیے لا انتہا رکھنا ہوں میں

در بیا بانِ طلبِ پیوستہ می کو شمیم ما

موجِ بحرِیم و شکستِ خویشِ بردِ شمیم ما

کوششِ ناتمام

فرقتِ آفتاب میں کھاتی ہے سچ و تاب صبح
رہتی ہے قیسِ روزِ کوئی شام کی ہوس
کہنا تھا قطبِ آسماں قافلہٗ نجوم سے
سوتوں کو ندیوں کا شوقِ بحرِ کاندیوں کو عشق
حسنِ ازل کہ پردہ لاد و گل میں ہے نہاں

چشمِ شفق ہے خوںِ نشاںِ اخترِ شام کے لیے
اخترِ صبحِ مضطربِ تابِ دوام کے لیے
ہم رہو! میں ترس گیا لطفِ خرام کے لیے
موجِ بحرِ کو تپشِ ماہِ تمام کے لیے
کہتے ہیں بے قرار ہے جلوہٗ عام کے لیے

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خمستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

نوائے غم

زندگانی ہے مری مثلِ ربابِ خاموش جس کی ہر رنگ کے نغموں ہے لبریزِ آغوش
بربطِ کون و مکان جس کی خموشی پہ نثار جس کے ہزار ہیں سیکڑوں نغموں کے مزار
محشرستانِ نوا کا ہے میں جس کا سکوت اور منت کش ہنگامہ نہیں جس کا سکوت

آہ! امیدِ محبت کی بر آئی نہ کبھی

چوٹِ مضراب کی اس ساز نے کھائی نہ کبھی

مگر آتی ہے نسیمِ چمنِ طور کبھی سمتِ گردوں سے ہوائِ نفسِ حور کبھی
چھیرا آہستہ سے دیتی ہے مزارِ حیات جس سے ہوتی ہے رہا روجِ گرفتارِ حیات
نغمہ یاس کی دھیمی سی صدا اٹھتی ہے اشک کے قافلے کو بانگِ درا اٹھتی ہے

جس طرح رفعتِ شبنم ہے مذاقِ رم سے

میری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے!

محشرِ اہرور

نہ مجھ سے کہہ کر اجل ہے پیامِ عیشِ دسرد نہ کھینچ نقشہ کیفیتِ شرابِ طہور
فراقِ حوریں ہو غم سے ہم کنار نہ تو پری کو شیشہ الفاظ میں اتار نہ تو
مجھے فریفتہ ساقیِ جمیل نہ کر بیانِ حور نہ کر، ذکرِ سلسبیل نہ کر

مقام امن ہے جنت، مجھے کلام نہیں
 شباب آہ! کہاں تک امیدوار رہے!
 شباب کے لیے موزوں تر پیام نہیں
 وہ عیش و عیش نہیں، جس کا انتظار رہے
 وہ حسن کیا کہ جو محتاجِ چشمِ بینا ہو
 نمود کے لیے منت پذیرِ فردا ہو
 عجیب چیز ہے احساسِ زندگی کا
 عقیدہ ”عشرتِ امروز“ ہے جوانی کا

انسان

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے!
 انسان کو رازِ جو بنایا
 راز اس کی نگاہ سے چھپایا
 بیتاب ہے ذوقِ آگہی کا
 کھلتا نہیں بھیدِ زندگی کا
 حیرتِ آغاز و انتہا ہے
 آئینے کے گھر میں اور کیا ہے؟

ہے گرمِ خرامِ موجِ دریا
 بادل کو ہوا اڑا رہی ہے
 دریا سوئے بحرِ جادہ پیمہ
 شانوں پہ اٹھائے لا رہی ہے
 تارے مستِ شرابِ تقدیر
 خورشید، وہ عابدِ سحرِ خیز
 لانے والا پیام ”برخیز“
 پیتا ہے عے شفق کا ساغر
 مغرب کی پہاڑیوں میں چھپ کر
 لذت گیرِ وجودِ ہر شے
 سرمستِ عے نمودِ ہر شے

کوئی نہیں غمگسارِ انسان!
 کیا تلخ ہے روزگارِ انسان!

جلوہ حسن

جلوہ حسن کہ ہے جس سے تمنا بیتاب
پالتا ہے جسے آغوش تجیل میں شباب
ابدی بنتا ہے یہ عالم فانی جس سے
ایک افسانہ رنگیں ہے جوانی جس سے
جو سکھاتا ہے ہمیں سر بہ گریباں ہونا
منظر عالم حاضر سے گریزاں ہونا
دور ہو جاتی ہے ادراک کی خامی جس سے
عقل کرتی ہے تاثر کی غلامی جس سے

آہ! موجود بھی وہ حسن کہیں ہے کہ نہیں؟

خاتم دہر میں یارب وہ نگیں ہے کہ نہیں؟

ایک شام

(دریائے نیکر (ہائیل برگ) کے کنارے پر)

خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
دادی کے نوا فروش خاموش
کھسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بیہوش ہو گئی ہے
آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کافسوں ہے
نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے
یہ قافلہ بے درارواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا
قدرت ہے مراقبے میں گویا

اے دل! تو بھی خموش ہو جا

آغوش میں غم کو لے کے سو جا

تنہائی

تنہائی شب میں ہے حزیں کیا؟ انجم نہیں تیرے ہم نشیں کیا؟
 یہ رفعت آسمان خاموش خوابیدہ زمیں، جہاں خاموش
 یہ چاند، یہ دشتِ درد بہ کھسار فطرت ہے تمام فسترن زار
 موتی خوش رنگ پیائے پیائے یعنی، ترے آنسوؤں کے تائے

کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل!

قدرت تری ہم نفس ہے اے دل!

سیارِ عشق

سن اے طلبکارِ درد پہلو! میں ناز ہوں تو نیاز ہو جا
 میں غزنویِ سو مناتِ دل کا ہوں تو سراپاِ ایاز ہو جا
 نہیں ہے وابستہ زیرِ گردوں کمالِ شانِ سکندری سے
 تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا
 غرض ہے پیکارِ زندگی سے کمالِ پائے ہلال تیرا
 جہاں کا فرضِ جدید ہے تو، ادا مثالِ نماز ہو جا
 نہ ہو قناعتِ شعارِ گلچیں، اسی سے قایم ہے شانِ تیری
 و فورِ گل ہے اگر چین میں، تو اور دامنِ دراز ہو جا

گئے وہ ایام، اب زمانہ نہیں ہے صحرانوردیوں کا
جہاں میں مانندِ شمع سوزاں میانِ محفلِ گداز ہو جا

وجود افراد کا مجازی ہے، ہستی قوم ہے حقیقی
فراہودت پہ، یعنی آتشِ زینِ طلسم مجاز ہو جا
یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آزدی کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامنِ بتوں سے اپنا غبارِ راہ مجاز ہو جا

فراق

تلاشِ گوشہ عزت میں پھر رہا ہوں میں یہاں پہاڑ کے دامن میں آچسپا ہوں میں
شکستہ گیت میں چشموں کے دلبری ہے کمال دعائے طفلِ کب گفتارِ آزما کی مثال
ہے تختِ لعلِ شفق پر جلوںِ اخترِ شام بہشتِ دیدہ بینا ہے حسنِ منظرِ شام

سکوتِ شامِ جدائی ہوا بہانہ مجھے
کسی کی یاد نے سکھلا دیا ترانہ مجھے

یہ کیفیت ہے مری جانِ ناشکیبا کی مری مثال ہے طفلِ صغیرِ تنہا کی
اندھیری رات میں کرتا ہے وہ سرودِ آغاز صدا کو اپنی سمجھتا ہے غیر کی آواز
یو نہیں میں دل کو پیامِ شکیب دیتا ہوں
شبِ فراق کو گویا فریب دیتا ہوں

عبدالقادر کے نام

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افتی خادر پر
ایک فریاد ہے ماندر سپند اپنی بساط
اہل محفل کو دکھا دیں اثر صیقل عشق
جلوہ یوسف گم گشتہ دکھا کر ان کو
اس چمن کو سبق آئین نموکا دے کر
رختِ جاں بتکدہ چیں سے اٹھالیں اپنا
دیکھ! شرب میں ہوا ناقہ لیلے بیکار
یادہ دیرینہ ہوا درگرم ہوا ایسا کہ گداز
گرم رکھتا تھا ہمیں سردی غریبیں جو داغ
شمع کی طرح جیئیں بزمِ گم عالم میں
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
اسی ہنگامے سے محفل نہ دبالا کر دیں
سنگِ امروز کو آئینہ فردا کر دیں
تپشِ آمادہ تر از خونِ زلیخا کر دیں
قطرہ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں
سب کو محورِ رخِ سعدی و سلیمی کر دیں
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں
جگر شیشہ و پیمانہ و مینا کر دیں
چیر کر سینہ اسے وقف تماشا کر دیں
خود جلیں، دیدہ اغیار کو مینا کر دیں
ہر چہ در دل گزر دو وقفِ زباں دار و شمع
سو خفتن نیست خیالے کہ نہاں دار و شمع

صقلیہ
(جنزیرہ سلسلی)

روئے لب دل کھول کر اے دیدہ فونابہ بار!
نعاہد ہاں ہنگامہ ان صحرائے نشینوں کا کبھی
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار!
بحرِ بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

ز لرزے جن سے شہنشاہوں کے دربار میں تھے بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
 اک جہان نازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور کھا گئی عصہ کھن کو جن کی تیغِ ناصبور
 مردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قہم سے ہوا آدمی آزاد زنجیر تو ہم سے ہوا
 غفلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے

کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے؟

آہ! اے سسلی! سمندر کی ہے تجھ سے آبرو رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو
 زیب تیرے فال سے رخسارِ دریا کو رہے تیری شمعوں سے تسلی بحرِ میا کو رہے
 ہو سبکدوشم مسافر پر ترانہ نظرِ مدام موجِ رقصاں تیرے ساحل کی چٹانوں پر یاد

تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا

حسنِ عالم سوزِ جن کا آتشِ نظارہ تھا

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر دانشِ رویا فون کے آنسو جہاں آباد پر
 آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی ابنِ بدروں کے دلِ ناشاہنے فریاد کی

غم نصیبِ اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا

چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستان؟ تیرے ساحل کی خموشی میں ہے اندازِ بیاں
 درد اپنا تجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں جس کی تو منزل تھا، میں اس کا ڈال کی گرد ہوں

رنگِ تصویرِ کھن میں بھر کے دکھلا دے مجھے قصہِ ایامِ سلف کا کہہ کے ٹڑپا دے مجھے

میں ترانہ محفہ سوئے ہندوستان لے جاؤں گا

خود یہاں روتا ہوں، اوروں کو دہاں روتاؤں گا

غزلیات

زندگی انسان کی اک دم کے سوا کچھ بھی نہیں! دم ہو کی وجہ ہے، دم کے سوا کچھ بھی نہیں!
 لگی، تبسم کبہ رہا تھا زندگانی کو، مگر شمع بولی، گریہ غم کے سوا کچھ بھی نہیں!
 راز ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو کھل گیا جس دم، تو حرم کے سوا کچھ بھی نہیں!

زائرانِ کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی
 کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں؟

.....

الہی عقلِ خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
 اسے ہے سودائے نجبہ کاری، مجھے سر پرین نہیں ہے
 ملا محبت کا سوز مجھ کو، تو بولے صبحِ ازل فرشتے
 مثالِ شمعِ مزار ہے تو، تری کوئی انجمن نہیں ہے
 یہاں کہاں ہم نفسِ میسر، یہ دیس نا آشنا ہے اے دل
 وہ چیز تو مانگتا ہے تجھ سے کہ زبرِ چرخِ کج نہیں ہے
 نرالا سا ہے جہاں سے اس کو غرب کے معمار نے بنا یا
 بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے
 کہاں کا آنا، کہاں کا جانا، فریب ہے اتیارِ عقیبی
 نمود ہر شے میں ہے ہماری، کہیں ہمارا وطن نہیں ہے
 مایہِ بر خزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے
 جو کام کچھ کر رہی ہیں تو میں، انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

زمانہ دیکھے گا جب مرے دل مجھے شراٹھے گا گفتگو کا
 مری خوشی نہیں ہے، گویا مزار ہے حرفِ آرزو کا
 جو موجِ دریا لگایا کہتے سفر سے قائم ہے شانِ میری
 گھر، بولا صدفِ نشینی ہے مجھ کو سامانِ آبرو کا!
 نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابلِ وہ تربیت سے نہیں سنوتے
 ہوا نہ سر سبز رہ کے پانی میں عکسِ سر و کنارِ جو کا
 کوئی دل ایسا نظر نہ آیا، نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
 الہی تیرا جہان کیا ہے! نگار خانہ ہے آرزو کا!
 کھلایہ کر کہ زندگی اپنی تھی طلسمِ ہوس سراپا
 جسے سمجھنے تھے جسمِ خاکی، غبار تھا کوئے آرزو کا
 اگر کوئی شے نہیں ہے نہاں تو کیوں سراپا تلاش ہو میں؟
 نگہ کو نظارے کی تمنا ہے، دل کو سودا ہے جستجو کا
 چمن میں گلچیں سے غنچہ کھتا تھا، انا بیدار کیوں ہوا ناں؟
 تری رنگا ہوں میں ہے بستمِ شکستہ ہونا مرے سب کو کا
 ریاضِ ہستی کے ذرے ذرے سے ہے حجت کا جلو ا پیدا
 حقیقت لگی کو تو جو سمجھے تو یہ بھی بیاں ہے رنگِ دلو کا
 تمام مضمون مرے پرانے، کلامِ میرا خطا سراپا
 ہنر کوئی دیکھتا ہے مجھ میں تو عیب ہے میرے عیب جو کا

سپاس شرطِ ادب ہے در نہ کرم تر ہے ستم سے بڑھ کر
 ذرا سا اک دل دیلے، وہ بھی فریب خوردہ ہے آرزو کا
 کمالِ دھلت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے توجہ چھوڑے
 یقین ہے مجھ کو گسے رگ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا
 گیا ہے تقلید کا زمانہ، مجازِ رختِ سفر اٹھائے !
 ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا؟
 جو گھر سے اقبالِ دور ہوں میں، تو ہوں نہ محروںِ عزیز میرے
 مثالِ گوہرِ وطن کی فرقت کمال ہے میری آبرو کا !



جھلک تیری ہویا چاند میں، سورج میں، تاریں	چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں، شراب میں
روانی بحر میں، افتاد گئی تیری کنارے میں	بلندی آسمانوں میں، زمینوں میں تری پستی
پھنسا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں	شریعت کیوں گریباں گیر ہو ذوقِ تکلم کی
شجر میں پھول میں، جیواں میں، پتھر میں، سنگ میں	جو ہے بیدار انسان میں وہ گہری نیند سونا ہے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرابے میں	مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرہ اشکِ محبت نے
وہ سوداگر ہوں میں نے نفع دیکھا ہر خسے میں	نہیں جلسِ ثوابِ آخرت کی آرزو مجھ کو
تڑپ کس دل کی یارب چپکے آبیٹھی ہے پارے میں	سکوں نا آشنا رہنا اسے سامانِ ہستی ہے

صدائے لمن ترانی سن کے اے اقبال میں چپ ہوں
 تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے مارے میں



یوں تولے بزمِ جہاں! دلکش تھیں نگاہیں ترے
 اک ذرا افسردگی تیرے تماشاؤں میں تھی
 پاگئی آسودگی کو لے محبت میں وہ خاک
 مدقول آوارہ جو حکمت کے صحراؤں میں تھی
 کس قدر اے مجھے رسمِ حجاب آئی پسند
 پردہ انگور سے نکلی تو میناؤں میں تھی
 حسن کی تاثیر پر غالب نہ آسکتا تمنا علم
 اتنی نادانی جہاں کے سارے داناؤں میں تھی

میں نے لے اقبال! یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث

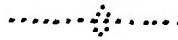
بات جو ہندوستان کے ماہِ سیماؤں میں تھی



مثال پر تو ہے، طوفِ جام کرتے ہیں
 یہی نماز ادا صبح و شام کرتے ہیں!
 خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم! تری
 شجر، حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں
 نیا جہاں کوئی اے شمع! ڈھونڈ بیٹے کہ یہاں
 ستم کش تپیش، ناتمام کھرتے ہیں
 بھلی ہے ہم نفسو! اس چہن میں خاموشی
 کہ خوشنواؤں کو پابندِ دام کرتے ہیں
 غرض نشاط ہے شعلِ شراب سے جن کی
 حلال چیز کو گویا حرام کرتے ہیں
 بھلا نیچے گی تری ہم سے کیونکر اے داعظ!
 کہ ہم تو رسمِ محبت کو عام کرتے ہیں
 الہی سحر ہے پیرانِ غرقہ پوش میں کیا!
 کہ اک نظر سے جوانوں کو رام کرتے ہیں
 میں ان کی محفلِ عشرت سے کانپ جاتا ہوں
 جو گھر کو کچھ نک کے دنیا میں نام کرتے ہیں
 ہرے رہو وطنِ مازنی کے میدا نو!
 جہاز پر سے تہیں ہم سلام کرتے ہیں

جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نمازِ اقبال

بلکہ کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں



مارچ ۱۹۰۷ء

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہوگا
 سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
 گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چپکے پیتے تھے مینے والے
 بنے گا سارا جہان مینخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا
 کبھی جو آوارہ جنوں تھے، وہ بستیوں میں پھر آلیں گے
 برہنہ پائی وہی رہے گی، مگر نیا خازن ہوگا
 سنا دیا گوشِ منتظر کو حجاب کا خاموشی نے آخر
 جو عہد صحرائیوں سے باندھا لیا تھا پھر استوار ہوگا
 نکل کے صحرا سے جس نے روم کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
 سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
 کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کی انجمن میں
 تو پیر مینخانہ سن کے کہنے لگا کہ نہ پھٹ ہے، خوار ہوگا
 دیا مرغِ بک رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے!
 کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زیرِ کم عیار ہوگا!
 تنہا رہی تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
 جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

سفینہ بر گلی بنلے گا قافلہ مویر ناتواں کا
 ہزار موجوں کی ہو کشاکش، مگر یہ دریائے پار ہو گا
 جن میں لالہ دکھانا پھر تلے ہے داغ اپنا کلی کلی کو
 یہ جانتا ہے کہ اس دکھا دے سے دل جلوں میں شمار ہو گا
 جو ایک تھا اے نگاہ! تو نے ہزار کسے ہمیں دکھایا
 یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہو گا؟
 کہا جو قمری سے میں نے اک دن یہاں کے آنا دیا بگل میں!
 تو غنچہ کہنے لگے، ہمارے چین کا یہ راز دار ہو گا!
 خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مار مارے
 میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا
 یہ رسمِ نیمِ فنا ہے اے دل! گناہ ہے جنبشِ نظر بھی
 رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہو گا
 میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے در ماندہ کارواں کو
 شرفِ نشاں ہو گی آہ میری، نفس! اشعلہ بار ہو گا
 نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
 تو اک نفس میں جہاں سے ملنا تجھے مثالی شرار ہو گا
 نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا، ابھی وہی کیفیت ہے اس کی
 کہیں سر راہ گزار بیٹھا ستم کش انتظار ہو گا!

حصہ سوم

۷۱۹۰۸ء سے ...

ہلا د اسلام

سرزمینِ دہلی کی مسجدِ دہلی غم دیدہ ہے ذلّے ذلّے میں لہوِ اسلاف کا خوابیدہ ہے
پاک اس اجڑے گلستان کی نہ ہو کیونکر زمیں ! خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سرزمین
سوئے ہیں اس خاک میں خیرالام کے تاجدار نظمِ عالم کا راجن کی حکومت پر مدار

دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرجی محفل کی یاد

جل چکا حاصل، مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد

ہے زیارت گاہِ مسلم کو جہاں آباد بھی اس کرامت کا مگر حقدار ہے بغداد بھی
یہ چین وہ ہے کہ تھا جس کے لیے سامانِ ناز لالہ صحرا، جسے کہتے ہیں تہذیبِ حجاز
خاک اس بستی کی ہو کیونکر نہ ہمدوشِ ارم جس نے دیکھے جانشینانِ پیہر کے قدم
جس کے غنچے تھے چینِ ساماں، وہ گلشن ہے یہی !

کانپتا تھا جن سے ردا، ان کا مدفن ہے یہی !

ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدہ مسلم کا نور ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمعِ طور
بجھ کے بزمِ ملتِ بیضا پریشاں کر گئی اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی

قراس تہذیب کی یہ سرزمین پاک ہے

جس سے تاکِ گلشنِ یورپ کی رک نمناک ہے

خطّہ قسطنطنیہ، یعنی قیصر کا دیار مہدی امت کی سطوت کا نشانِ پایدار
صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمین بھی پاک ہے آستانِ مسندِ آراءِ شہِ لولاک ہے
نکبتِ گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا تربتِ ایوب انصاری سے آتی ہے صدا

اے مسلمان ملت اسلام کا دل ہے یہ شہر!

سیکڑوں صدیوں کی کشت و خوں کا حاصل ہو یہ شہر!

وہ نہیں ہے تو مگر اے خوابگاہِ مصطفیٰ! دید ہے کعبہ کو تیری حج اکبر سے سوا

خاتم ہستی میں تو تاباں ہے مانندِ نکلیں اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں

تجھ میں رحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی جس کے دامن میں اماں اقوام عالم کو ملی

نام لیوا جس کے شاہنشاہ عالم کے ہوئے جانشینِ قیصر کے، دارتِ مسندِ جم کے ہوئے

ہے اگر قومیتِ اسلام پا بندِ مقام ہند ہی بنیا دی ہے اس کی، نہ فارس ہر نہ شام

آہ! شرب! دیں ہے مسلم کا تو مادی ہے تو نقطہ جاذبِ تاثر کی شعاعوں کا ہے تو

جب تلک باقی ہے تو دنیا میں، باقی ہم بھی ہیں

صبح ہے تو اس چمن میں گو ہر شبنم بھی ہیں

ستارہ

قمر کا خوف کہ ہے خطرہ سحرِ نجمہ کو مالِ حسن کی کیا مل گئی خبر نجمہ کو؟

متارے نور کے لٹ جانے کا ہے ڈر نجمہ کو؟ ہے کیا ہر اس فنا صورتِ شر نجمہ کو؟

زمیں سے دُور دیا آسماں نے گھر نجمہ کو مثالِ ماہِ اڑھائی قبلے زرنجمہ کو

غضب ہے پھر تری نقیسی جان ڈرتی ہے!

تمام رات تری کانپتے گزرتی ہے

چمکنے والے مسافر! عجب یہ بستی ہے جو اوجِ ایک کا ہے دوسرے کی بستی ہے

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر فنا کی نیند مے زندگی کی مستی ہے

وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینش گلِ عدم، عدم ہے کہ آئینہ دارِ مستی ہے!
 سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
 ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں!

دوستائے

آئے جو قراں میں دوستائے کہنے لگا ایک دوسرے سے
 یہ وصل مدام ہو تو کیا خوب انجامِ خرام ہو تو کیا خوب
 تھوڑا سا جو مہرِ ہاں فلک ہو ہم دونوں کی ایک ہی چمک ہو
 لیکن یہ وصال کی تمنا پیغامِ فراق تھی سراپا
 گر دش تاروں کا ہے مقدر ہر ایک کی راہ ہے مقرر
 ہے خوابِ ثباتِ آشنائی آئینِ جہاں کا ہے جدائی!

گورستانِ شاہی

آسماں بادل کا پہنہ خرقہٴ دیرینہ ہے کچھ مکدر سا جبینِ ماہ کا آئینہ ہے
 چاند فی پھیلے ہے اس نظارہٴ خاموش میں صبحِ صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں
 کس قدر اشجار کی حیرتِ فزا ہے خامشی بر بطنِ قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی

باطن ہر ذرّہ عالم سراپا درد ہے

اور خاموشی لبِ ہستی پہ آہِ سرد ہے

آہ! جو لانگاہِ عالم گیر، یعنی وہ حصارِ دوش پر اپنے اٹھائے سیکڑوں صدیوں کا بار

زندگی سے تھا کبھی معمور اب سنان ہے یہ غمخیز اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے

اپنے سکانِ کہن کی خاک کا دلدادہ ہے

کوہ کے سر پر مثالِ پاسباںِ استاد ہے

ابر کے روزن سے وہ بالائے بامِ آسمان ناظرِ عالم ہے بحکمِ سبز فامِ آسمان

خاکبازی و سعتِ دنیا کا ہے منظر اسے داستانِ ناکامی انسان کی ہے انبراسے

ہے ازل سے یہ مسافر سوئے منزلِ جارہا آسمان سے انقلابوں کا تاشاد یکھتا

گو سکون ممکن نہیں عالم میں آخر کے لیے فاتحہ خوانی کو یہ ٹھہرا ہے دم بھر کے لیے

رنگ و آپِ زندگی سے لگی بدامن ہے زمیں

سیکڑوں خوں گشتہ تہذیبوں کا مدفن ہے زمیں!

خواجگہ شاہوں کی ہے یہ منزلِ حسرتِ فزا دیدارِ عبرت! خراجِ اشکِ گلگوں کر ادا

ہے نوگورستان، مگر یہ خاکِ گردوں پایہ ہے آہ! اک برگشتہ قسمتِ قوم کا سرمایہ ہے!

مقبوروں کی شانِ حیرتِ آفریں ہے اسقدر جنبشِ مژگاں سے ہے چشمِ تماشا کو حذر

کیفیتِ ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں

جو اتر سکتی نہیں آئینہ تحریر میں

سوتے ہیں خاموش، آبادی کے ہنگاموں دور مضطرب کھلتی تھی جن کو آرزوئے ناظور

فرقِ ظلمت میں ہے ان آفتابوں کی چمک جن کے دروازوں پر رہتا تھا جبیں گتر فلک

کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مال
جن کی تدبیر جہان بانی سے ڈرتا تھا زوال
رعب غفوری ہو دنیا میں، کشتانِ قیصری
ٹل نہیں سکتی غنیم موت کی یورش کبھی

بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور
جادہٴ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

شورشِ بزمِ طرب کیا! عود کی تقریر کیا!
دردِ دندانِ جہاں کا نالہ شبِ گیر کیا!
عرصہٴ پیکار میں، ہنگامہٴ شمشیر کیا!
خون کو گر جانے والا نعرہٴ تکبیر کیا!
اب کوئی آواز سونوں کو جگا سکتی نہیں

سینہٴ دیبراں میں جانِ رفتہ آسکتی نہیں

روحِ مشتِ خاک میں زحمت کش بیدار ہے
کوچہ گر دئے ہو جس دمِ نفس، فریاد ہے
زندگی انسان کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم، چہچہایا، اڑ گیا
آہ! کیا آئے ریاضِ دہریں ہم، کیا گئے!
زندگی کی شاخ سے پھوٹے، کھلے، مرجھا گئے!

موت ہر شاہِ دگر کے خواب کی تعبیر ہے
اس ستم گر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

سلسلہٴ ہستی کا ہے اک بحرِ ناپید اکناں
اداس دریائے بے پایاں کی موجیں میں مزار
اے ہوس! اخوں رو کہ ہے یزندگی بے اعتبار
یہ شرابے کا تبسم، یہ نخسِ آتش سوار
چاند، جو صورتِ گرہِ ہستی کا اک اعجاز ہے
پہنے سیمائی قبا محوِ خرامِ ناز ہے
جرخِ بے انجم کی دہشتناک وسعت میں مگر
بیکسی اس کی کوئی دیکھے ذرا دقتِ سحر

اک ذرا سا ابر کا ٹکڑا ہے، جو مہتابِ تنہا
آخری آنسو ٹپک جانے میں ہو جس کی فنا

زندگی افوام کی بھی ہے یونہی بے اعتبار
اس زیاں خانے میں کوئی ملت گروہ و قار
اس قدر قوموں کی بربادی سے ہے غور جہاں
ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار
رنگہائے رفتہ کی تصویر ہے ان کی بہار
رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوش روزگار
دیکھتا بے اعتنائی سے ہے یہ منظر جہاں
فدویِ جدت سے ہے ترکیب مزاج روزگار

ہے نگین دہر کی زینت ہمیشہ نامِ نو

مادرِ گیتی رہی آہستہ اقوامِ نو!

ہے ہزاروں قافلوں سے آشنایہ گزر
مصر و بابل مٹ گئے باقی نشان تک بھی نہیں
آدبِ مہرِ ایراں کو اجل کی شام نے
چشمِ کوہ نور نے دیکھے ہیں کتنے تاجور!
دفترِ ہستی میں ان کی داستاں تک بھی نہیں
عظمتِ یونان در دما لوٹ لی آیام نے

آہ! مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا

آسماں سے ابرِ آذاری اٹھا، برسا، گیا

ہے رگِ گل صبح کے اشکوں سے موتی کی لڑپی
سینہ دریا شعاعوں کے لیے گہوارہ ہے
موجِ زینت ہے صنوبر، جو بار آئینہ ہے
نعرہ زن رہتی ہے کوئلِ باغ کے کاشانہ میں
اور بلبل، ہطربِ رنگیں نوائے گلستاں
عشق کے ہنگاموں کی اڑتی ہوئی تصویر ہے
باغ میں خاموش جلسے گلستاں زادوں کے ہیں
زندگیاں سے یہ پرانا خاکہ اداں معمور ہے
کوئی سورج کی کرنِ شبنم میں ہے الجھی ہوئی
کس قدر پیارا لب جو مہر کا نظارہ ہے!
غنچہ گل کے لیے بادِ بہار آئینہ ہے
چشمِ انساں سے نہاں، پتوں کے عزاتِ فانی ہیں
جس کے دم سے زندہ ہے گویا ہوا گلستاں
خامہ قدرت کی کیسی شوخ یہ تحریر ہے!
وادِ کی کہسار میں نعرے شہاں زادوں کے ہیں
موت میں بھی زندگانی کی تڑپ مستور ہے

پتیاں پھولوں کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح دستِ طفلِ خفته سے رنگیں کھلونے جس طرح

اس نشاطِ آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے

ایک غم، یعنی غمِ ملت ہمیشہ تازہ ہے

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں

اشکباری کے بہانے میں یہ اجڑے بامِ ودر گم یہ پیہم سے بیٹا ہے ہماری چشمِ تر

دہر کو دیتے ہیں موتی دیدہ گریاں کے ہم آخری بادل میں آگ گورے ہوئے طوفاں کے ہم

ہیں ابھی صد ہاتھ اس ابر کی آغوش میں برقی ابھی باقی ہے اس کے سینہ خاموش میں

دادی گل خاکِ صحر کو بنا سکتا ہے یہ خواب سے امیدِ بہقاں کو جگا سکتا ہے یہ

ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور

ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

نمودِ صبح

ہو رہی ہے زیرِ دامنِ افق سے آشکار صبح، یعنی دخترِ دوشیزہ لیل و نہار

پاچکا فرصتِ درودِ فعلِ انجم سے سپہر کشتِ خاور میں ہوا ہے آفتابِ آئینہ کار

آسمان نے آمدِ خورشید کی پاکر خبر حملِ پردازِ شب باندھا سرِ دوشِ غبار

شعلہٴ خورشید گویا حاصلِ اس کیفیت کی ہے بوئے تھمے دہقانِ گردِ دُش جو تاروں کے شرار

ہے رواں نجمِ سحر جیسے نیراتِ خانے سے سب سے پیچھے جائے کوئی عابدِ شب زندہ دار

کیا سماں ہے جس طرح آہستہ آہستہ کوئی کینچنتا ہو میان کی ظلمت سے تیغِ آبِ دار

مطلعِ خورشید میں مضر ہے یوں مضمونِ صبح جیسے خلوتِ گاہِ مینا میں شرابِ خوشگوار

ہے تیرا مان بادِ اختلاطِ انگیز صبحِ شورشِ ناقوس، آوازِ اداں سے ہمنار
جلاگے کوئل کی اداں سے طائرینِ نغمہ سنج
ہے ترنمِ زیرِ قافونِ سحر کا تار تار

تضمین پر شکرِ انیسویں شالو

ہمیشہ صورتِ بادِ سحرِ آوارہ رہتا ہوں
دلِ میناب جہاں پہا دیارِ پیرِ سحر میں
ابھی نا آشنائے لب تھا حرفِ آرزو میرا
یہ فرقہ صد آئی "حرم کے رہنے والوں کو
ترا لے قیس! کیونکر ہو گیا سوزِ دردِ ٹھنڈا؟
نہ نظمِ لا الہ تیری زمینِ شور سے بھوٹا
تجھے معلوم ہے غافل کہ تیری زندگی کیا ہے؟
ہوئی ہے تربیتِ آغوشِ بیت اللہ میں تیری
محبت میں ہے منزل سے بھی خوشتر جادہ پیمائی
بیتسے جہاں درماں دردِ ناشکیبائی
زباں ہونے کو تھی منت پذیرِ تابِ گویائی
شکایت تجھ سے ہے اے تارِ اکینِ آبائی!
کہ لپٹی میں تو ہیں اب تک وہی اندازِ لیلائی
زمانے بھر میں سوا ہے تری فطرت کی نازائی
کفشتی ساز، معمرِ نواہائے کلیسائی
دلِ شوریدہ ہے لیکن صنمِ خانے کا سودائی

”دفا آموختی از ما، بگاہِ دیگران کردی
ربودی گوہرے ازمانتارِ دیگران کردی“



فلسفہ غم

(میاں فضل حسین صاحب سٹریٹ لالہ ہور کجام)

گوسرا پاکینِ عشرت ہے شرابِ زندگی اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحابِ زندگی
موجِ غم پر رقص کرتا ہے جبابِ زندگی ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی
ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں

جو خزاں نادیدہ ہو بلبل، وہ بلبل ہی نہیں

آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں نغمہٴ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں
دیدہ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہے روح کو سامانِ زینت آہ کا آئینہ ہے
حادثاتِ غم سے ہے انسان کی فطرت کو کمال غمازہ ہے آئینہٴ دل کے لیے گردِ ملاں
غمِ جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے ساریہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے
طاہرِ دل کے لیے غم شہرِ پرواز ہے راز ہے انسان کا دل، غم انکشافِ راز ہے

غم نہیں غم، روح کا اک نغمہٴ خاموش ہے

جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے

شامِ جن کی آشنائے ناہ "یارب! نہیں جلوہٴ پیر جس کی شب میں اشک کے کوکب نہیں
جس کا جامِ دل شکستِ غم سے ہے نا آشنا جو سلامتِ شرابِ عیش و عشرت ہی رہا
ہاتھ جن گلیں کا ہے خوفِ خاکِ خاک سے عشق جس کا بے خبر ہے ہجر کے آزار سے
کلفتِ غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور ہے زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے

اے کہ نظم دہر کا ادراک ہے حاصل تجھے
کیوں نہ آساں ہو غم داندوہ کی منزل تجھے

ہے ابد کے نسخہ دیرینہ کی تہید عشق عقل انسانی ہے فانی زندہ جاوید عشق
عشق کے غور شید سے شام اجل شرمندہ ہے عشق سوز زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے
رخصت محبوب کا مقصد فنا ہوتا اگر جوش الفت بھی دل عاشق سے کر جاتا سفر
عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جانا نہیں روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جانا نہیں
ہے بقائے عشق سے پیدا بقا محبوب کی

زندگانی ہے عدم نا آشنا محبوب کی

آتی ہے ندی جبین کوہ سے گاتی ہوئی آسمان کے طائر دوں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی
آئینہ روشن ہے اس کا صورتہ رخسار چور گر کے دادی کی چٹانوں پر یہ ہو جانا ہے چور
نہر چوتھی اس کے گوہر پیاسے پیاسے بن گئے یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے
جوئے سیلاب رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی
ہجران فطروں کو لیکن وصل کی نعیم ہے دو مقام پر پھر وہی جو مثل تارِ سیم ہے
ایک اصلیت میں ہے نہر رواں زندگی گر کے رفعت سے ہجوم نوح انساں بن گئی

پستی عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم

عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں
عقل جس دم دہر کی آفات میں محصور ہو یا جوانی کی اندھیری رات میں مستور ہو
دامن دل بن گیا ہو رزم گاہ خیر و شر راہ کی ظلمت سے ہو مشکل سوئے منزل سفر

خفیز ہمت ہو گیا ہو آرزو سے گوشہ گیر فکر جب عاجز ہواد خاموش آوازِ ضمیر
دادی ہستی میں کوئی ہمسفر تک بھی نہ ہو جادہ دکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو

مرنے والوں کی جبین روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری لٹ میں

پھول کا تحفہ عطا ہونے پر

وہ مست ناز جو گلشن میں جا نکلتی ہے کلی کلی کی زباں سے دعا نکلتی ہے
”ابلی پھولوں میں وہ انتخاب مجھ کو کرے !“ کلی سے رشک بگل آفتاب مجھ کو کرے !“
تجھے وہ شاخ سے ٹوٹیں! زہے نصیب تیرے تڑپتے رہ گئے گلزار میں رقیب تیرے
اٹھا کے صدمہ فرقت وصال تک پہنچا تیری جہات کا جوہر کمال تک پہنچا
مرا کنول کہ نصرتی ہیں جس پہ اہل نظر مرے شباب کے گلشن کو ناز ہے جس پر
کبھی یہ پھول ہم آغوشِ مدعا نہ ہوا کسی کے دامنِ رنگیں سے آشنا نہ ہوا

شگفتہ کر نہ سکے گی کبھی بہار اسے
فسردہ رکھتا ہے گلچیں کا انتظار اسے

تراہِ ملی

چین و عرب ہمارا، ہندوستان ہمارا مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے آساں نہیں ہیں مٹا نا نام و نشان ہمارا
دنیا کے تنگ دلوں میں پہلا وہ گھر خدا کا ہم اس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا

تیغوں کے سائے میں ہم پہل کر جلاں ہوئے ہیں
 منہرب کی دایلوں میں گونجی اذراں ہماری
 باطل سے دبنے والے اے آسمان نہیں ہم
 اے گلستانِ اُتارُس! وہ دن ہیں یاد تجھ کو
 اے موجِ دجلہ! تو کبھی پہچانتی ہے ہم کو
 اے ارضِ پاک! تیری حرمت پہ کٹا کرے ہم
 سالارِ کارواں ہے میرِ حصارِ اپنا
 خنجرِ ہلاں کلمہ ہے قومی نشان ہمارا
 تھمتنا نہ تھا کسی سے سبیل رواں ہمارا
 سوار کر چکا ہے تو امتحان ہمارا
 تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا
 اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا
 ہے خون تری رگوں میں اب تک رواں ہمارا
 اس نام سے ہے باقی آرامِ حباں ہمارا

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا

ہوتا ہے جاوہرِ پیمبرِ کارواں ہمارا

وطنیت

(یعنی وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے)

اس دور میں مے اور پے جام اور ہے جم اور
 مسلم نے کبھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
 ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
 تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرِ بن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

بہت کرتا شیدہ تہذیبِ نوی ہے
 غارت گر کا شانہ دینِ نبوی ہے
 باز تیرا تو جید کی قوت سے قوی ہے
 اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے

اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی رہ بحر میں آزاد وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الہی دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے

ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوام جہاں میں ہے رقابتِ تواسی سے تفسیر ہے مقصودِ تجارتِ تواسی سے

خالی ہے صداقت سے سیاستِ تواسی سے کمزور کا گھر ہوتا ہے غارتِ تواسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے

قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

ایک حاجی مدینے کے راستے میں

قافلہ لٹا گیا صحرا میں، اور منزل ہے دور
ہم سفر میرے شکارِ دشمن نہ ہرن ہوئے
اس بخاری نوجوان نے کس خوشی سے جان دی!
خبر نہ ہرن اسے گویا ہلالِ عید تھا
خوف کہتا ہے کہ "شیرب کی طرف تہا نہ چل،"
بے زیارت سوئے بیت اللہ پھر جاؤں گا کیا؟
خوفِ جاں رکھتا نہیں کچھ دشتِ پیمائے حجاز
اس بیاباں، یعنی بحرِ خشک کا ساحل ہے دور
بچ گئے جو، ہو کے بیدل سوئے بیت اللہ پھر
موت کے نہراں میں پائی ہے اس نے زندگی!
"ہائے شیرب،" دل میں، لبِ پرنعرہ توجہ تھا
شوق کہتا ہے کہ "تو مسلم ہے، بیابا کا نہ چل،"
عاشقوں کو روزِ محشر منہ نہ دکھلاؤں گا کیا؟
ہجرتِ مدفونِ شیرب میں یہی مخفی ہے راز

گوسلامت محفل شامی کی ہمراہی میں ہے
 عشق کی لذت مگر خطروں کی جانکاہی میں ہے
 آہ! یہ عقلِ زریاں اندیش کیا چالاک ہے!
 اور تاثرِ آدمی کا کس قدر بے باک ہے!

قطرہ

کل ایک شوریدہ خواب گاہِ نبی پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
 کہ مصروفِ ہندوستان کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں!
 یہ زائرانِ حریمِ مغرب ہزار رہ رہتے ہیں ہمارے!
 ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا تو کجھ سے نا آشنا رہے ہیں!
 غضب ہیں یہ ”مرشدانِ خود ہیں“، خلافتِ قوم کو بچائے!
 بگاڑ کر تیرے مسلمانوں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں!
 سُننے کا اقبال کون ان کو یہ انجمن ہی بدل گئی ہے
 نئے زمانے میں آپ ہم کو پُرانی باتیں سنارہے ہیں

شکوہ

کیوں زریاں کاربنوں سود فراموش رہوں؟
 لکھ فرودا نہ کروں، مجو غیم دوش رہوں
 نالے بلب کے سنوں؟ اور بہتین گوش رہوں
 ہمنوا! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں؟
 جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
 شکوہ اللہ سے، فاکم بدہن ہے مجھ کو

ہے بجا شیوہ تسلیم میں مشہور ہیں ہم قصہ درو سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
سازِ خاموش ہیں، فریاد سے معذور ہیں ہم نالہ آتا ہے اگر لب پہ، تو معذور ہیں ہم

اے خدا! شکوہ ارباب و قابھی سن لے

خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے

تھی تو موجود ازل سے ہی تری ذاتِ قدیم پھولِ تمنا زیبِ چین، پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرطِ انصاف ہے اے صاحبِ لطفِ عظیم بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم؟

ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی

ور نہ اُمتِ ترے محبوب کی دیوانی تھی

ہم سے پہلے تھا عجب نیرے جہاں کا منظر کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبودِ شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر مانتا پھر کوئی اُن دیکھے خدا کو کیونکر؟

تبجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟

قوتِ باز دے مسلم نے کیا کام ترا!

بس رہے تھے ہمیں سلجوق بھی، تورانی بھی اہلِ چین چین میں، ایران میں ساسانی بھی

اسی معورے میں آباد تھے یونانی بھی اسی دنیا میں یہودی بھی تھے، نصرانی بھی

پر ترے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے؟

بات جو بگڑی ہوئی تھی، وہ بنائی کس نے؟

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں ! خشکیوں میں کبھی لڑتے، کبھی دریاؤں میں

دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

شان آنکھوں میں نہ جیتی تھی جہانداروں کی

کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ہم جو جیتے تھے، تو جنگوں کی مصیبت کے لیے اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لیے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لیے سرکھن پھرتے تھے کیا دہریں دولت کے لیے

قوم اپنی جو زرد مال جہاں پر مرنے
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی!

ٹل نہ سکتے تھے، اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے پاؤں شیروں کے بھی میدان سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہو کوئی، تو گھٹ جاتے تھے تیغ کیا چیز ہے؟ ہم تو پست لڑ جاتے تھے

نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے

زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درخبر کس نے؟ شہرِ قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے؟
توڑے مخلوقِ خداوندوں کے سیکر کس نے؟ کاٹ کر رکھ دیے کفار کے لشکر کس نے؟

کس نے ٹھنڈا کیا آتشِ کدہِ ایراں کو؟

کس نے پھر زندہ کیا نذرہِ یزداں کو؟

کون سی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی؟ اور تیرے لیے زحمت کش پیکار ہوئی؟
کس کی شمشیر جہانگیر، جہاندار ہوئی؟ کس کی تکبیر سے دنیا تری بیزار ہوئی؟

کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے

منہ کے بل گر کے صُحُوحُ اللہِ اُحدا کہتے تھے!

آگیا عینِ لڑائی میں اگر وقتِ نماز۔ قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے!

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے!

محفل کون و مکاں میں سحر و شام پھرے مے توجید کو لے کر صفت جام پھرے
کوہ میں، دشت میں لے کر ترا پیغام پھرے اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے؟

دشت تو دشت ہیں، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے!

بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے!

صفحہ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے نورِ انسان کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جہینوں سے بسایا ہم نے تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفا دار نہیں

ہم وفا دار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں!

امین اور بھی ہیں، ان میں گنہگار کبھی ہیں عجز والے بھی ہیں، مست مے پندار بھی ہیں

ان میں کاہل بھی ہیں، غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں سیکڑوں ہیں کہ تے نام سے بزار بھی ہیں

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر!

بتِ ستم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے، ہے خوشی ان کو کہ کعبے کے نگہبان گئے

منزل دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے

خندہ زن کفر ہے، احساسِ تجھے ہے کہ نہیں؟

اپنی توجید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں؟

یہ شکایت نہیں، ہیں ان کے خزانے معمور نہیں محفل میں جنہیں بات بھی کرنے کا شعور

تہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور اور ہے چارے مسلمان کو فقط وعدہ حور!

اب وہ الطاف نہیں، ہم پہ عنایات نہیں

بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں؟

کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دنیا نایاب تیری قدرت تو ہے وہ جسکی نہ در ہے نہ حساب
تو جو چاہے تو اٹھے سینہ صحرائے حباب رہر و دشت ہوسیلی زدہ مہیج سراب
طعنِ اغیار ہے، رسوائی ہے، ناداری ہے

کیا تیرے نام پر مرنے کا عوض خواری ہے؟
بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا رہ گئی اپنے لیے ایک خیالی دنیا!
ہم تو رخصت ہوئے اور وہ نے سنبھالی دنیا پھر نہ کہنا ہوئی تو حید سے خالی دنیا!
ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں تر نام رہے

کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے، جام رہے؟
تیری محفل بھی گئی، چاہنے والے بھی گئے شب کی آہیں بھی گئیں، صبح کے نالے بھی گئے!
دل نہجہ دے بھی گئے، اپنا سہلے بھی گئے آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور زکالے بھی گئے
آکے عشاق، گئے وعدہ فرمالے کر
اب انھیں ڈھونڈ چیرا رخِ زیبائے لکر!

دردِ لبی بھی وہی، قیس کا پہلہ بھی وہی نجد کے دشت و جبل میں رسم آہو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی جن کا جادو بھی وہی امتِ احمدؐ مرسل بھی وہی، تو بھی وہی
پھر یہ آزر دگی غیر سبب کیا معنی؟
اپنے شیداؤں پہ یہ چشمِ غضب کیا معنی؟

تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربی کو چھوڑا؟ بت گری پیشہ کیا؟ بت شکنی کو چھوڑا؟
عشق کو عشق کی آشفتمہ سری کو چھوڑا؟ رسمِ سلمانؓ دادِ ریشِ قرنی کو چھوڑا؟

آگِ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں!
زندگی مشعلِ ہلالِ جہشِ رکھتے ہیں!

عشق کی خیر، وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی جادہ پیرائی تسلیم درضا بھی نہ سہی
 مضطرب دل دمخت قبلہ نما بھی نہ سہی اور پابندی آئین وفا بھی نہ سہی
 کبھی ہم سے، کبھی غروں سے شناسائی ہے
 بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہر جائی ہے!

سرفراں پیکار دین کو کامل تو نے اک اشارے میں ہزاروں کے لیے دل تو نے
 آتش اندوز کیا عشق کا حاصل تو نے پھونک دی گرمی رخسار سے محفل تو نے
 آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں؟
 ہم دی سوختہ سماں ہیں، تجھے یاد نہیں؟

دادی نجد میں دہ شور سلاسل نہ رہا قیس دیوانہ نظارہ حمل نہ رہا
 حوصلے دہ نہ رہے، ہم نہ رہے، دل نہ رہا گھریہ اجڑا ہے کہ تور و لیل محفل نہ رہا
 اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی
 بے حجابانہ سوئے محفل ما باز آئی!

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لب جو بیٹھے سنتے ہیں جام بکفت نغمہ کو کو بیٹھے
 دور ہنگامہ گلزار سے یک سو بیٹھے تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ کھو بیٹھے!
 اپنے پردانوں کو کچھ ذوقِ خود افروزی دے
 برقی دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

قومِ آوارہ غناں تاب ہے پھر سوئے حجاز لے اڑا بلبلی بے پر کو مذاقِ پرداز
 مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز تو ذرا چھوڑ دوئے آتشِ مضطرب ساز
 نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے
 طور مضطرب ہے اسی آگ میں جلنے کے لیے!

مشکلیں امتِ مرحوم کی آساں کر دے مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیمان کر دے
جنسِ نایابِ محبت کو پھرازاں کر دے ہند کے دیر نشینوں کو مسلمان کر دے

جوئے خوں می چکد از حسرتِ دیرینہ ما

می تبہ نالہ بہ نشتر کہہ سینہ ما!

بڑے گل لے گئی بیرونِ چین، رازِ چین کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں نثارِ چین
عہدِ گل ختم ہوا، ٹوٹ گیا سازِ چین اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پر وازِ چین

ایک بلبیل ہے کہ ہے محو ترنم اب تک

اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

قریاں شاخِ صنوبر سے گزراں بھی ہوئیں پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کرے پریشاں بھی ہوئیں
دہ پرانی رویشِ باغ کی دیراں بھی ہوئیں ڈالیاں پیر میں برگ سے عریاں بھی ہوئیں

قدیم موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی

کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی!

لطفِ مرنے میں ہے باقی، نہ مزا جینے میں کچھ مزا ہے تو یہی خونِ بگس پینے میں!
کتنے بیتاب ہیں جو ہر مرے آئینے میں کس قدر جلوئے تڑپتے ہیں مرے سینے میں!

اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں

داغ جو سینے میں رکھتے ہوں وہ لالے ہی نہیں

چاک اس بلبیلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں جاگنے والے اسی بانگِ در سے دل ہوں

یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیلا سے دل ہوں

عجی ٹھہرے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری

نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی مری

چاند

اے چاند! حسن تیرا فطرت کی آبرو ہے طوفِ حریمِ خاکی تیری قدیم خو ہے
یہ داغِ سا جو تیرے سینے میں ہے نمایاں عاشق ہے تو کسی کا؟ یہ داغِ آرزو ہے؟
میں مضطرب زمیں پر، بیتاب تو فلک پر تجھ کو بھی جستجو ہے، مجھ کو بھی جستجو ہے
انساں ہے شمع جس کی، محفلِ دہی ہے تیری

میں جس طرف رواں ہوں، منزلِ دہی ہے تیری؟

تو ڈھونڈتا ہے جس کو تاروں کی خاشی میں پوشیدہ ہے وہ شاید غوغائے زندگی میں
استادہ سروں میں ہے سبزہ میں سو رہا ہے بلبلیں نغمہ زن ہے خاموش ہے کلی میں
آئیں تجھے دکھناؤں رخسارِ روشن اس کا نہروں کے آئینے میں، شبنم کی آرسی میں
صحرا و دشتِ ددریں کہسار میں دہی ہے
انساں کے دل میں، تیرے رخسار میں دہی ہے

رات اور شاعر

(۱)

رات

کیوں میری چاندنی میں پھرتا ہے تو پریشاں خاموش صورتِ گل، مانندِ بُو پریشاں
تاروں کے موتیوں کا شاید ہے جوہری تو چھلی ہے کوئی میرے دریاے نور کی تو
یا تو مری جیسیں کا تارا اگر اہوا ہے رفعت کو چھوڑ کر جو پستی میں جا بسا ہے

خاموش ہو گیا ہے نارِ رباب ہستی ہے میرے اُینے میں تصویرِ خواب ہستی
 دریا کی تہ میں چشمِ گرداب سو گئی ہے ساحل سے لگ کے موجِ بیتاب سو گئی ہے
 بستی زمیں کی کیسی ہنگامہ آفس ہے یوں سو گئی ہے جیسے آباد ہی نہیں ہے
 شاعر کا دل ہے لیکن نا آشنا سکوں سے
 آزاد رہ گیا تو کیونکر مرے فسون سے؟

(۲)

شاعر

میں ترے چاند کی کمی میں گھر جوتا ہوں چھپ کے انسانوں سے مانندِ سحر و تاہوں
 دن کی شورش میں نکلتے ہوئے شراتے ہیں عزتِ شب میں مرے اشکِ ٹپکا جاتے ہیں
 مجھ میں فریاد جو پنہاں ہے سناؤں کس کو؟ تپشِ شوق کا نظارہ دکھاؤں کس کو؟
 برقِ امین مرے سینہ پہ پڑی ردتی ہے دیکھنے والی ہے جو آنکھ، کہاں سوتی ہے؟
 صفتِ شمعِ لمحہ مردہ ہے محفلِ میری آہ! اے راتِ بڑی دور ہے منزلِ میری
 عہدِ حاضر کی ہو اس نہیں ہے اس کو اپنے نقصان کا احساس نہیں ہے اس کو

ضبطِ پیغامِ محبت سے جو گھبراتا ہوں
 تیرے تابندہ ستاروں کو سنا جاتا ہوں

بزمِ اکھم

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو طشتِ افق سے لیکر لالے کے پھول مارے
 پہنایا شفق نے سونے کا سارا زیور قدرت نے اپنے گھنے چاندی کے سبائے

محل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی
چمکے عروسِ شب کے وہ موتی پیارے پیارے
وہ ددر رہنے والے ہنگامہ جہاں سے
کہتا ہے جن کو انساں اپنی زباں میں "تارے"

محوِ فلکِ فروزی تھی انجمنِ فلک کی

عرشِ بریں سے آئی آواز اک ملک کی

اے شب کے پاسباں! اے آسماں کے تارو! تابندہ قوم ساری گر دوشِ نشیں تمہاری

چھپر دوسر و دایاں، جاگ اٹھیں سونے والے رہبر ہے قافلوں کی تابِ جہیں تمہاری

آئینے قسمتوں کے تم کو یہ جانتے ہیں شاید سنیں صدائیں اہلِ زمین تمہاری

رخصت ہوئی خموشی تاروں بھری فضا سے

دسعت تھی آسماں کی معمور اس نوا سے

"حسنِ ازل ہے پیدا تاروں کی دلبری میں جس طرح عکسِ گل ہوشِ بنم کی آرسی میں

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کھن پہ اڑنا منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

یہ کاروانِ ہستی ہے تیز گام ایسا قومیں کچل گئی ہیں جس کی روادری میں

آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں

اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے جو بات پاگئے ہم تھوڑی سی زندگی میں

ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے

پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں"

سیرِ فلک

تھا تخیل جو ہم سفر میرا آسماں پر ہوا گزر میرا
اڑتا جاتا تھا، اور نہ تھا کوئی جانے والا چرخ پر میرا
تاکے حیرت سے دیکھتے تھے مجھے رازِ سر بستہ تھا سفر میرا

حلقہٴ صبح و شام سے نکلا

اس پرانے نظام سے نکلا

کیا سناؤں تمہیں ارم کیا ہے خاتمِ آرزوئے دیدہ و گوش
شاخِ طوبے بے پغتمہ ریزِ طیور بے حجابانہ حور جلوہ فروش
ساقیانِ جمیل جامِ بدست پینے والوں میں شورِ نوشانوش
دورِ جنت سے آنکھ نے دیکھا ایک تاریک خانہ، سرد و خموش
طالعِ قیس و گیسوئے لیلیٰ اس کی تاریکیوں سے دوش بدوش
خنک ایسا کہ جس سے شرما کر کرۂ زمہریر ہو رو پوش
میں نے پوچھی جو کیفیت اس کی جرت انگیز تھا جوابِ شروش
یہ مقامِ خنک جہنم ہے نار سے نور سے تہی آغوش
شعلے ہوتے ہیں مستعار اس کے جن سے لرزاں ہیں مردِ عرت کوش

اہلِ دنیا یہاں جو آتے ہیں

اپنے انگارے ساتھ لاتے ہیں!

نصیحت

میں نے اقبال سے ازراہ نصیحت یہ کہا
تو بھی ہے شیوہ اربابِ ریا میں کامل
جھوٹ بھی مصلحت آمیز ترا ہوتا ہے
ختمِ تقریر تری مدحت سرکار پہ ہے
درِ حکام بھی ہے تجھ کو مقامِ محمود
اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے
نظرِ آملے مسجد میں بھی تو عید کے دن
دست پر در در ترے ملک کے اخبار بھی ہیں
اس پہ طرہ ہے کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے
جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے وہ ہیں تجھ میں سبھی
غمِ صیاد نہیں، اور پرو بال بھی ہیں

جابلِ روزہ پہنوا، اور نہ پا بند نماز
دل میں لندن کی ہوس، لب پہ ترے ذکرِ جوار
تیرا اندازِ مملکت بھی سراپا عجاز
فکرِ روشن ہے ترا موجدِ آئینِ نیاز
پالسی بھی تری پیچیدہ تر از زلفِ ایاز
پردہ خدمتِ دیں میں ہو جس جاہ کا راز
اثرِ وعظ سے ہوتی ہے طبیعت بھی گداز
چھپرنا فرض ہے جن پر تری تشہیر کا سار
تیری مینائے سخن میں ہے شرابِ شیراز
تجھ کو لازم ہے کہ ہوا طح کے شریکِ ننگ و تاز
پھر سبب کیا ہے نہیں تجھ کو دماغِ پرداز

”عاقبت منزلِ مادائی خاموشانِ است
حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز“

سماں

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
یہ ہندیوں کے فکرِ فلک رس کا ہے اثر
سب فلسفی ہیں خطہ مغرب کے رام ہند
رفعت میں آسمان سے بھی اونچا ہے بامِ ہند

اس دہلی میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک مشرت
 مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند
 ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز
 اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
 اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی
 روشن تر از سحر ہے زلف میں شام ہند
 تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
 پاکیزگی میں، جوش محبت میں فرد تھا

ط
 مکر

کیسی پتے کی بات مجھ کو نہ کرنے کی کچی
 ہنگامہ آفرین نہیں اس کا خرام ناز
 میں نے کہا نہیں ہے یہ موٹر پہ منحصر
 جادو حیات میں ہر تیز یا خموش
 ہے پاشکستہ شیوہ فریاد سے جرس
 نکلت کا کارواں ہے مثال صبا خموش
 مینا مدام شورش قلقل سے پابگل
 لیکن مزاج جام خرام آشنا خموش
 شاعر کے فکر کو پہرہ پر داز خامشی
 سرمایہ دار گھر می آواز خامشی

السان

منظر چمنستان کے، زریا ہوں کہ نازیبا
 محروم عمل فرگس، مجبور تماشا ہے
 رفتار کی لذت کا احساس نہیں اس کو
 فطرت ہی صنوبر کی محروم تمنا ہے!

تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں
 انسان کی ہر قوت، سرگرم تقاضا ہے!
 اس ذرہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم
 یہ ذرہ نہیں، شاید سمٹا ہوا صحرا ہے
 چاہے تو بدل ڈالے ہیت چمنستاں کی
 یہ ہستی دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے

خطاب بہ جوانانِ اسلام

کبھی اے نوجوانِ مسلم! تدبیر بھی کیا تو نے؟
 وہ کیا گر دوں تھا، تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟
 تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
 کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سردارا
 تمدنِ آفریں، خلاقِ آئینِ جہاں داری
 وہ صحرائے عرب، یعنی شتر بانوں کا گھوڑا
 سماں الْفَقْرُ فَخْرُی کا رہا شانِ امارت میں
 ”بابِ درنگ و خال و خطِ حاجتِ ردے زیبارا“
 گدا ئی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
 کہ منعم کو گرا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
 غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحائفیں کیا تھے
 جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

اگر چاہوں تو نقشہ کیصنچ کر الفاظ میں رکھ دوں
 مگر تیرے تجل سے فزوں نہ ہے وہ نظارہ
 تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
 کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارا
 گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
 ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
 حکومت کا تو کیا رونکا وہ اک عارضی شے تھی
 نہیں دنیا کے آئینِ مسلم سے کوئی چارا
 مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
 جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیارا
 ”غنی ردِ سیاح پیر کنواں راتا شاکن
 کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا“

غزۂ شوال

یا
 ہلالِ عید

غزۂ شوال! اے نورِ نگاہِ روزہ دار! آ! کہ تجھے تیرے لیے مسلم سراپا انتظار
 پری پیشانی پہ تحریرِ پیامِ عید ہے شام تیری کیل ہے صبحِ عیش کی تمہید ہے
 سرگشتِ ملتِ بیضا کا تو آئینہ ہے اے مہ نو! ہم کو تجھ سے الفتِ دیرینہ ہے

شمع اور شاعر

فروری ۱۹۱۲ء

شاعر

دوش می گفتم یہ شمع منزل ویران خویش
 گیسوئے توار پر پردانہ دارد شانہ
 در جہاں مثل چراغِ لالہ صحرایم
 نے نصیب محفلے، نے قسمت کاشانہ
 مدتے مانند تو من ہم نفس می سو ختم
 در طواف شعلہ ام بالے نہ زد پردانہ
 می طپد صد جلوه در جان اہل فرسودن
 بر نمی خیزد ازین محفل دل دیوانہ

از کجا این آتش عالم فروزان دختی؟
 کر مکب بے مایہ را سوزِ کلیم آموختی!

شمع

مجھ کو جو موجِ نفس دیتی ہے پیغامِ اجل
 لب اسی موجِ نفس سے ہے نوا پیرا ترا

میں تو جلتی ہوں کہ ہے مضمیری فطرت میں سوز
 تو فردزاں ہے کہ پردانوں کو ہو سودا ترا
 گر یہ ساماں میں، کہ میرے دلمیں ہے طوفانِ اشک
 شبم افشاں تو، کہ بزمِ گل میں ہو چہر چا ترا
 گل بدامن ہے مری شب کے لہو سے میری صبح
 ہے ترے امروز سے نا آشنا فردا ترا
 یوں تو روشن ہے، مگر سوزِ دروں رکھتا نہیں
 شعلہ ہے مثلِ چراغِ لالہ صحرَا ترا
 سوچ تو دل میں لقبِ ساقی کل ہے زیبا تجھے؟
 انجمنِ پیاسی ہے اور پیمانہ بے صہبا ترا
 اور ہے تیرا شعراءِ آئینِ ملت اور ہے
 زشتِ ردئی سے تری آئینہ ہے، سو ترا
 کعبہ پہلو میں ہے، اور سودائی بتما نہ ہے
 کس قدر شوریدہ سر ہے شوقِ بے پردا ترا!
 قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں
 تنگ ہے صحرَا ترا، تحمل ہے بے لیدا ترا
 اے دُرِ تابندہ! اے پروردہ آغوشِ موج!
 لذتِ طوفاں سے ہے نا آشنا دریا ترا

اب نوا پیرا ہے کیا؟ گلشن ہوا برہم ترا!
 بے محل تیرا ترنم، نغمہ بے موسم ترا

تھا جنہیں ذوقِ تماشا، وہ تو رخصت ہو گئے
 لے کے اب تو وعدہ دیدارِ عام آیا تو کیا
 انجمن سے وہ پرانے شعلہ آ شام اٹھ گئے
 ساقیا! محفل میں تو آتشِ بجام آیا تو کیا
 آہ! جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی
 پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا
 آخر شب دید کے قابلِ تھی بسمل کی تڑپ
 صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
 بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصودِ ہر پردانہ تھا
 اب کوئی سودائی سوزِ تمام آیا تو کیا

پھول بے پرواہ ہیں، تو گرم نوا ہو یا نہ ہو !
 کارواں بے حس ہے، آوازِ دریا ہو یا نہ ہو
 شمعِ محفل ہو کے تو جب سوز سے خالی رہا
 تیرے پردانے بھی اس لذت سے بیگانے رہے
 رشتہ الفت میں جب ان کو پردہ سکتا تھا تو
 پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے؟
 شوقِ بے پروا گیا، فکرِ فلک پیا گیا
 تیری محفل میں نہ دیوانے، نہ فرزانے رہے
 وہ جگر سوزی نہیں، وہ شعلہ آ شامی نہیں
 فائدہ پھر کیا جو گردِ شمع پردانے رہے؟

خیر تو ساقی سہی، لیکن پلائے گا کسے؟
 اب نہ ذہ میکش رہے باقی، نہ مینا نے رہے!
 رد رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اسے
 کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے!
 آج ہیں خاموش وہ دشت جنوں پر درجہاں
 رقص میں لیلارہی، لیلکے دیولنے رہے!

وائے ناکامی متابع کارواں جاتا رہا
 کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

جن کے ہنگاموں سے تھے آباد دیرانے کبھی
 شہران کے مٹ گئے، آبادیاں بن ہو گئیں
 سطوتِ توحید قائم جن نمازدوں سے ہوئی
 وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہو گئیں
 دہریں غیشِ دوام آئیں کی پابندی سے ہے
 موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں
 خود بجلی کو تمنا جن کے نظاروں کی تھی
 وہ نگاہیں ناامید نورِ امین ہو گئیں
 اڑتی پھرتی تھیں ہزاروں بلبلیں گلزار میں
 دل میں کیا آئی کہ پابندِ نشیم ہو گئیں؟
 وسعتِ گردوں میں تھی ان کی تڑپِ نظارہ سوز
 بجلیاں آسودہ دامنِ خرمن ہو گئیں

دیدہ خونبار ہو منت کش گلزار کیوں؟
 اشکِ پیہم سے نگاہیں گلِ بدامن ہو گئیں
 شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبحِ عید کی
 ظلمتِ شب میں نظر آئی کمرن امیر کی

مژدہ اے پیمانہ بردارِ خستہ حجاز!

بعد مدت کترے زندوں کو پھر آیا ہے ہوش

نقدِ خود داری بہائے بادۂ اغیار تھی

پھر دکانِ تیری ہے لبرِ صدائے ناکِ نوش

ٹوٹنے کو ہے طلسمِ ماہِ سیما یاں ہند

پھر سلیمی کی نظر دیتی ہے پیغامِ خروش

پھر یہ غوغا ہے کہ لاساقی شرابِ فانی ساز

دل کے ہنگامے دے مغرب نے کر ڈالے خموش

نغمہ پیرا ہوا کہ یہ ہنگامِ خاموشی نہیں

ہے سحر کا آسمانِ خورشید سے مینا بدوش

در غم دیگر بسوز و دیگر اں را ہم بسوز

گفتمت روشن حدیثے، اگر توانی دارِ گوش

کہہ گئے ہیں شاعری جزوِ لیست از پیغمبری

ہاں سنا دے محفلِ ملت کو پیغامِ سروش!

آنکھ کو بیدار کر دے وعدہ دیدار سے

زندہ کر دے دل کو سوزِ جو ہر گرفتار سے

رہزن ہمت ہوا ذوق تن آسانی ترا
 بحر تھا صحرا میں تو، گلشن مثل جو ہوا
 اپنی اصلیت پہ قائم تھا، توجہیت کبھی تھی
 چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروانِ بو ہوا
 زندگی فطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
 یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا
 پھر کہیں سے اس کو پیدا کر، بڑی دولت ہے یہ
 زندگی کیسی جو دل بیگانہ پہلو ہوا
 آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی

جب یہ جمعیت گئی، دنیا میں رسوا تو ہوا
 فرد قائم ربطِ ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
 موج ہے دریا میں، اور بیرونِ دریا کچھ نہیں
 پردہ دل میں محبت کو ابھی مستور رکھ
 یعنی اپنی مے کو رسوا صورتِ مینا نہ کر
 خیمہ زن ہو دادی سینا میں مانندِ کلیم
 شعلہ تحقیق کو غارت گرِ کاشانہ کر
 شمع کو بھی ہو ذرا معلوم انجامِ ستم
 صرفِ تعمیرِ سحرِ فاکسٹر پر دانہ کر
 تو اگر خود دار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو
 عینِ دریا میں جناب آساں گلوں پیمانہ کر

کیفیت باقی پرانے کوہِ دھرا میں نہیں
 ہے جنوں تیرا نیا، پیدا نیا دیرانہ کر
 خاک میں تجھ کو مقدر نے ملایا ہے اگر
 تو عصا افتاد سے پیدا مثالِ دانہ کر
 ہاں! اسی شاخِ کہن پر پھر بنالے آئیاں
 اہل گلشن کو شہیدِ نغمہِ ستانہ کر
 اس چمن میں پیروِ بلبل ہو یا تلمیذِ گل
 یا سراپا نالہ بن جا، یا نوا پیدا نہ کر
 کیوں چمن میں بے صدا مثلِ رمِ شبنم ہے تو؟
 لب کشا ہو جا سرودِ بریطِ عالم ہے تو؟
 آشنا اپنی حقیقت سے ہوائے دہقانِ اذرا
 دانہ تو، کبیتی بھی تو، باران بھی تو، حاصل بھی تو
 آہ! کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
 راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو
 کانپتا ہے دل ترا اندیشہٴ طوفاں سے کیا
 ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
 دیکھ آکر کوپہ چاکِ گریباں میں کبھی!
 قیس تو، لیلیٰ بھی تو، صحرا بھی تو، محل بھی تو
 دوائے نادانی! کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا
 مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

شعلہ بن کر پھونک دے فاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو
بے خبر! تو جو ہر آئینہِ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے!

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے، لیکن مثالِ بحر ہے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
سینہ ہے تیرا میں اس کے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے، پنہاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو سنیرے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے!
ابا ملک شاہد ہے جس پر کوہِ فاراں کا سکوت
اے نفاذِ پیشہ! تجھ کو یاد وہ پیاں بھی ہے؟
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے!
دل کی کیفیت ہے پیدا پردہِ تقدیر میں
کسوتِ مینا میں مستور بھی عریاں بھی ہے
پھونک ڈال ہے مری آتشِ نوائی نے مجھے
اور میری زندگانی کا بھی ساماں بھی ہے

راز اس آنشِ نوائی کا مرے سینے میں دیکھ
جلوہِ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ!

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمتِ رات کی سیلاب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنمِ آفریں بادِ بہار
نکھتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آئیں گے سینہ چاکاں چمن سے سینہ پاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی!
شبِ نیم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر گلی درد آشنا ہو جائے گی!
دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی!
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی!
نالہٴ صیاد سے ہوں گے نوا سا ماںِ طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی!
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!!

شبِ گریزاں ہوگی آخر جلوہٴ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہوگا نغمہٴ توحید سے!!

مسلم

جون ۱۹۱۲ء

ہر نفس اقبال تیرا آہ میں مستور ہے
نغمہ امید تیری بربطِ دل میں نہیں
گوشِ آوازِ سرورِ رفتہ کا جو یا ترا
قصہ گلِ ہم نوایاں چمن سنتے نہیں
سینہ سوزاں ترا فریاد سے معمور ہے
ہم سمجھتے ہیں یہ لیلیا تیرے محل میں نہیں
اور دل ہنگامہ حاضر سے بے پردہ ترا
اہلِ محفل تیرا پیغام کہن سنتے نہیں
ہے بہت یاس آفریں تیری صدا، خاموش رہ
اے درلے کاروانِ خفتہ پا! خاموش رہ

زندہ پھر وہ محفلِ دیرینہ ہو سکتی نہیں
شمع سے روشن شبِ دوشینہ ہو سکتی نہیں

ہم نشیںِ اسلام ہیں، توحید کا حامل ہوں میں
نبضِ موجودات میں پیدا حرارت اس سے ہے
حق نے عالم اس صداقت کے لیے پیدا کیا
دہریس غارت گردِ باطل پرستی میں ہوا
اس صداقت پر زل سے شاہدِ عادل ہوں میں
اور مسلم کے تخیل میں جسارت اس سے ہے
اور مجھے اس کی حفاظت کے لیے پیدا کیا
حق تو یہ ہے حافظِ ناموس ہستی میں ہوا
میرے مطمانے سے رسوائی کئی آدم کی ہے
جس کی نابانی سے افسوسِ سحرِ شرمندہ ہے
کہہ نہیں سکتے مجھے نویدِ پیکارِ حیات
کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسہ اپنی ملت کے مقدر پر مجھے

یاس کے غم سے ہے آزاد میرا روزگار فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوش کارزار
 ہاں یہ سچ ہے چشمِ بے عہد کہن رہتا ہوں میں اہل محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں
 یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
 سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاطِ افزا کو میں
 دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

حضور رسالت مآب میں

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامہ زمانہ ہوا جہاں سے باندھ کے رختِ سفر دانہ ہوا
 قیودِ شام و سحر میں بسر تو کی، لیکن نظامِ کہنہ عالم سے آشنا نہ ہوا
 فرشتے بزمِ رسالت میں لے گئے مجھ کو
 حضور آئیہ رحمت میں لے گئے مجھ کو

کہا حضور نے اے عنایبِ باغِ حجاز! کلی کلی ہے تری گرمیِ نوا سے گزار
 ہمیشہ سرخوش جامِ دلا ہے دل تیرا فتادگی ہے تری غیرتِ سجودِ نیاز
 اڑا جو پستی دنیا سے تو سوئے گردوں سکھائی تجھ کو ملائک نے رفعتِ پرواز

نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بو آیا
 ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا؟

”حضور! دہریں آسودگی نہیں ملتی تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
 ہزاروں لالہ دگل ہیں ریاضِ ہستی میں وفا کی جس میں ہو، وہ کلی نہیں ملتی
 مگر میں نذرِ کواکب آجیگنہ لایا ہوں جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جہلکتی ہے نری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں“

شفا خانہ حجاز

اک پیشوائے قوم نے اقبال سے کہا کھلنے کو جدہ میں ہے شفا خانہ حجاز
ہوتا ہے تیری خاک کا ہر ذرہ بے قرار سنتا ہے تو کسی سے جو افسانہ حجاز
دستِ جنوں کو اپنے بڑھا جیب کی طرف مشہور تو جہاں میں ہے دیوانہ حجاز

دار الشفا حوائی بطحا میں چاہیے

نبضِ مریض پنجہ عیسیٰ میں چاہیے

میں نے کہا کہ موت کے پردے میں ہر حیات پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت حجاز میں
تلخائے اجل میں جو عاشق کو مل گیا پایا نہ خضر نے مے عمر دراز میں
اوروں کو دیں حسیہ یہ پیغامِ زندگی میں موت ڈھونڈتا ہوں زمیں حجاز میں

آئے ہیں آپ لے کے شفا کا پیام کیا؟

رکھتے ہیں اہل درد مسیحا سے کام کیا؟

جواب شکوہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے، رفعت پہ نظر رکھتی ہے خاک سے اٹھتی ہے، گردوں پہ گزر رکھتی ہے

عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا

آسماں چیر گیا نالہ بے باک مرا

پیرِ گردن نے کہا سن کے کہیں ہے کوئی ! بولے سیارے، سرِ عرشِ بریں ہے کوئی !

چاند کہتا تھا انہیں، اہلِ زمیں ہے کوئی ! کہکشاں کہتی تھی، پوشیدہ یہیں ہے کوئی !

کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رخصتواں سمجھا

مجھے جنت سے نکالا ہوا انسان سمجھا !

تھی فرشتوں کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا ! عرشِ والوں پر بھی کھلتا نہیں یہ راز ہے کیا !

تا سرِ عرش بھی انساں کی نگ و ناز ہے کیا ؟ آگئی خاک کی چٹکی کو بھی پردان ہے کیا ؟

غافلِ آداب سے سکانِ زمیں کیسے ہیں !

شوخی و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں !

اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے تنہا جو سجودِ ملائک یہ وہی آدم ہے ؟

عالمِ کیف ہے، دانائے رموز کم ہے ہاں، مگر عجز کے اسرار سے نامحرم ہے

ناز ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو

بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو !

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا اشکِ بیتاب سے لبریز ہے ہیمانہ ترا

آسماں گیر ہوا نعرہٴ مستانہ ترا کس قدر شوخِ زباں ہے دلِ دیوانہ ترا !

شکرِ شکوے کو کیا حسینِ ادا سے تو نے

ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

ہم نو مائلِ بکرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں راہ دکھلائیں کسے ؟ ہر دینزل ہی نہیں

تربیت عام تو ہے، جو ہر قابل ہی نہیں جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گِل ہی نہیں

کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں

ٹھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

ہاتھ بے زور ہیں، الحاد سے دل خوگر ہے امنی باعثِ رسوائی پیغمبر ہیں

بت شکن اٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں تھا برا میثم پدر، اور سپر آزر ہیں

بادہ آشام نئے، بادہ نیا، خم بھی نئے

حرم کعبہ نیا، بت بھی نئے، تم بھی نئے

وہ بھی دن تھے کہ یہی مایہ رعنائی تھا! نازش موسمِ گل لالہ صحرائی تھا!

جو مسلمان تھا اللہ کا سودا ہی تھا کبھی محبوب تمہارا یہی ہر حال ہی تھا

کسی یکجائی سے اب عہدِ غلامی کر لو

ملت احمد مرسل کو مقامی کر لو!

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے! ہم سے کب پیار ہے؟ ہاں نیند تمہیں پیاری ہے

طبعِ آزاد پہ قیدِ رمضاں بھاری ہے تمہیں کبھو بھی آئینِ وفاداری ہے

قومِ مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں، تم بھی نہیں

جذبِ باہم جو نہیں، تحفِ انجم بھی نہیں

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن، تم ہو نہیں جس قوم کو پردائے نشین، تم ہو

بجلیاں جس میں ہوں آسودہ دھڑکن، تم ہو بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن، تم ہو

ہو نگو نام جو قبروں کی تجارت کر کے

کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم تپھر کے؟

صفحہ دہرے باطل کو ٹپایا کس نے ؟ نوع انسان کو غلامی سے چھڑایا کس نے ؟
میرے کعبے کو جینوں سے بسایا کس نے ؟ میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے ؟
تھے تو آبادہ تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو ؟

ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہوا !

کیا کہا ؟ بہرِ مسلمان ہے نقطہ وعدہ حور شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور !
عدل ہے فاطرِ ہستی کا ازل سے دستور مسلم آئیں ہوا کا فر تو طے حود و قصور

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں

جلوے طور تو موجود ہے موٹائی ہی نہیں

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک

حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں ؟

کیا زمانے میں پینے کی یہی باتیں ہیں ؟

کون ہے تارکِ آئین رسولِ مختار ؟ مصلحت و فتنہ کی ہے کس کے عمل کا میار ؟

کس کی آنکھوں میں سما یا ہے شعارِ اغیار ؟ ہو گئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار ؟

قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں

کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں !

جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صفِ آلا تو غریب زحمتِ روزہ جو کرتے ہیں گویا، تو غریب

نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا، تو غریب پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا، تو غریب

امراۃٴ دولت میں ہیں غافل ہم سے

زندہ ہے ملت بیعتا غرما کے دم سے

واعظ قوم کی وہ بختہ خیالی نہ رہی برقی طبعی نہ رہی، شعلہ متعالی نہ رہی
رہ گئی رسم اذان، روح بلالی نہ رہی فلسفہ رہ گیا، تلقین غزالی نہ رہی

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

یعنی وہ صاحب ادصاف حجازی نہ رہے

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلمان نابود ہم یہ کہتے ہیں کہ تحفہ کبھی کہیں مسلم موجود؟
وضع میں تم ہوں نصاریٰ، تو تمدن میں ہنود یہ مسلمان ہیں اجنبی دیکھ کے شرابی ہیں یہود

یوں تو سید کبھی ہو، مرزا کبھی ہو، افغان کبھی ہو

تم سبھی کچھ ہو، بناؤ تو مسلمان کبھی ہو

دم تقریر تھی مسلم کی صداقت بیباک عدل اس کا تھا قوی، لوٹ مراعات سے پاک
شجر فطرت مسلم تھا حیا سے نمناک تھا شجاعت میں وہ اک ہستی فوق الادراک

خود گدازی تم کیفیت صہبائش بود

خالی از خویش شدن صورت مینائش بود

ہر مسلمان رگ باطل کے لیے نشر تھا اس کے آئینہ ہستی میں عمل جو ہر تھا
جو بھروسہ تھا اسے قوت بازو پر تھا تہ تمہیں موت کا ڈر، اس کو خدا کا ڈر تھا

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر از بر ہو

پھر پسر قابل میراث پدر کیوں کر ہو!

ہر کوئی مست ہے ذوق تن آسانی ہے تم مسلمان ہو؟ یہ انداز مسلمان ہے؟
حیدری فقر ہے، نے دولت عثمانی ہے تم کو اسلام سے کیا نسبت روحانی ہے؟

وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر

اور تم خوار ہو گئے تارک قرآن ہو کر

تم ہو آپس میں غضبناک وہ آپس میں رحیم
 تم خطا کارو خطا میں، وہ خطا پوش و کریم
 چاہتے سب ہیں کہ ہوں ادجِ ثریا پہ مقیم
 پہلے دیسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم
 تختِ فغفور بھی ان کا تھا، سریر کے بھی
 یوں ہی باتیں ہیں کہ تم میں وہ حیت ہے کبھی؟

خود کشی شیوہ تمہارا، وہ غیور و خود دار
 تم اخوت سے گریزاں، وہ اخوت پہ نثار
 تم ہو گفتار سراپا، وہ سراپا کردار
 تم ترستے ہو کلی کو، وہ گلستان بہ کنار
 اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
 نقش ہے صفحہ ہستی پہ صداقت ان کی!

مثلِ انجم افقِ قوم پر روشن بھی ہوئے
 بتِ ہندی کی محبت میں برہمن بھی ہوئے
 شوقِ پرداز میں مہجورِ نشین بھی ہوئے
 بے عمل نمے ہی جواں دین سے بطن بھی ہوئے
 ان کو نہ ہند بیٹنے ہر بند سے آزاد کیا
 لاکے کعبے سے صنم خانے میں آباد کیا

قیسِ زحمت کش تنہا فی صحرا نہ رہے
 شہر کی کھلے ہوا، بادیہ پیمانہ رہے
 وہ تو دیوانہ ہے، بستی میں رہے یا نہ رہے
 یہ ضرور مچا ہے، حجابِ رخِ کیلا نہ رہے
 رگڑ جو نہ ہو، شکوہ بیداد نہ ہو
 عشقِ آزاد ہے، کیوں حسن بھی آزاد نہ ہو

عہدِ نور برق ہے، آتشِ زہن ہر خرم نہ ہے
 این اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے
 اس نئی آگ کا اقامِ کھن ایندھن ہے
 ملتِ ختمِ رُسل شعلہ بہ پیرا ہن ہے

آج بھی ہو جو براہِ میم کا ایساں پیدا
 آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

دیکھ کر رنگِ چین ہونہ پریشاں مالی کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چپکنے والی
 خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی گل بر انداز ہے خونِ شہد کی لالی
 رنگِ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنایتی ہے
 یہ نکلنے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

اتنی گلشنِ ہستی میں نمرِ جیدہ بھی ہیں اور محدودِ عمر بھی ہیں، خزاں دیدہ بھی ہیں
 سیکڑوں نخل ہیں، کاہیدہ بھی، بالیدہ بھی ہیں سیکڑوں بطنِ چین میں ابھی پوشیدہ بھی ہیں
 نخلِ اسلام نمونہ ہے برومندی کا
 پھل ہے یہ سیکڑوں صدیوں کی چین بند کی کا

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
 قافلہ ہونہ سکے گا کبھی دیراں تیرا غریبِ بانگِ در کچھ نہیں ساماں تیرا
 نخلِ شمعِ استی و در شعلہ دودریشہ تو

عاقبت سوز بود سایہ اندیشہ تو
 تو نہ مٹا جلے گا ایران کے مٹ جانے سے نشہ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
 ہے عیاں یورشِ تانار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
 کشتیِ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
 عصرِ نور ات ہے، دھندلا سنا سنا تو ہے

ہے جو ہنگامہ بیا یورشِ بلغاری کا غافلوں کے لیے پیغام ہے بیداری کا
 تو سمجھتا ہے، یہ سماں ہے دل آزاری کا امتحاں ہے ترے ایثار کا، خود داری کا
 کیوں ہراساں ہے مہیلِ فرسِ اعدا سے
 نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

چشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری کو کب قسمتِ اسکاں ہے خلافت تیری

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتنا سام ابھی باقی ہے

مثلِ بوقید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا رختِ برد و ش ہواے چمنستاں ہو جا
ہے ننک بایہ، تو ذرے سے بیاباں ہو جا نغمہ موج سے ہنگامہ طوفاں ہو جا

قوتِ عشق سے ہر لپٹ کو بالا کر دے
دہر میں اسیم محمدؐ سے اُجالا کر دے

ہو نہ یہ پھول، تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھرے بھی نہ ہو، خم بھی نہ ہو بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپشِ آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں، دامنِ کہسار میں، میدان میں ہے بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے
چین کے شہر، مرقش کے بیاباں میں ہے اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رُفَعْنَا لَكَ ذِكْرُكَ دیکھے

مردمِ چشمِ زمیں، یعنی وہ کالی دنیا وہ تمہارے شہدا پالنے والی دنیا
گر مٹی مہر کی پروردہ، ہلالی دنیا عشقِ دالے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا

تپشِ اندوز ہے اس نام سے پاے کی طرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری مرے در دلش! خلافت ہے جہانگیر تری
 ماسوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری تو مسلمان ہو تو تقدیر ہے تادیر تری
 کی محمدؐ سے وفاتو نے تو ہم تیرے ہیں
 یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

ساقی

نشا پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی
 جو بادہ کش تھے پرلے وہ اٹھتے جلتے ہیں کہیں سے آپ بقلے دوام لے ساقی
 کٹی ہے رات تو ہنگامہ گستری میں تری
 سحر قریب ہے، اللہ کا نام لے ساقی!

تمعلیم اور اس کے نتائج (التضمین برشعر ملاعرشی)

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
 ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
 گھر میں پردہ کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما لے کے آئی ہے مگر تیشہ فرما د بھی ساتھ

”تسخیم دیگر یہ کتب آریم و بکاریم ز نو
 کا نیچہ کشیم ز خجالت نتوان کرد درد“

قرب سلطان

تیز حاکم و محکوم مرٹ نہیں سکتی
جہاں میں خواجہ پرستی ہے بندگی کا کمال
مگر غرض جو حصولِ رضا کے حاکم ہو
پہلے طرزِ عمل میں ہزار مشکل ہے
مزا تو یہ ہے کہ یوں زیرِ آسماں رہیے
یہی اصول ہے سرمایہ سکونِ حیات
مگر فردش پہ ماٹل ہے تو، تو بسم اللہ
شریکِ بزمِ امیر و وزیر و سلطان ہو
پیامِ مرثیہ شیراز بھی مگر سن لے
کہ ہے یہ ستر نہاں خانہ ضمیرِ سردش

” محلِ نور تجلی است رائے انورِ شاہ

جو قربِ ادِ طلبی در صفائے نیتِ کوش“

شاعر

جوئے سرد و آفریں آتی ہے کہ سار سے
مستِ مے نخرام کا سن تو ذرا پیام تو
پھرتی ہے دادِ بول میں کیا ذخیرہ شخرا م ابر
نپ کے شرابِ لالہ گوں میکدہ بہار سے
زندہ وہی ہے کام کچھ جس کو نہیں قرار سے
کرتی ہے عشقِ بازیاں سبز و مرغزار سے

جامِ شرابِ کوہ کے خمکدے سے اڑاتی ہے
پست و بلند کر کے طے کھیتوں کو جا پڑاتی ہے

شاعر دل نواز بھی بات اگر کچھ کھری
ہوتی ہے اس کے فیض سے مزین زندگی ہری
شانِ خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں
کہتی ہے اس کی قوم جب اپنا شمار آوری
اہلِ زین کو نسخہٴ زندگی دوام ہے
خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے جو سنخوری
گلشنِ دہری میں اگر جوئے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو

نوید صبح

۱۹۱۲ء

آتی ہے مشرق سے جب ہنگامہ درد امن سحر
منزلِ ہستی سے کرجاتی ہے خاموشی سفر
محفلِ قدرت کا آخر ٹوٹ جاتا ہے سکوت
دیتی ہے ہر چیز اپنی زندگی کا ثبوت
چہچہاتے ہیں پرندے پاک پیغامِ حیات
باندھتے ہیں پھول بھی گلشن میں احرامِ حیات

مسلم خوابیدہ اٹھا، ہنگامہ آرا تو بھی ہو
وہ چمک اٹھا اُفتخ، گرم تقاضا تو بھی ہو

دسعتِ عالم میں رہ پیا ہو مثلِ آفتاب
دامنِ گردوں سے ناپید اہوں یہ داغِ سحاب
کھینچ کر خیرِ کمرن کا، پھر ہو سرگرمِ ستیز
پھر سکھاتا کیوں باطل کو آدھ گریز
توسرا پانور ہے، خوشتر ہے عریانی کجھے
اور عریاں ہو کے لازم ہے خود افغانی کجھے

ہاں! نمایاں ہو کے برقِ دیدہٴ خفاش ہو
اے دلِ کون و مکاں کے رازِ مضمر! فاش ہو!



دعا

یارِ دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے جو قلب کو گمراہ، جو روح کو تڑپا دے
 پھر دلیِ فالان کے ہر ذرے کو چمکا دے پھر شوقِ تماشا دے، پھر فراقِ تقاضا دے
 محرومِ تماشا کو پھر دیدہٴ بینا دے دیکھا ہے جو کچھ میں نے ادروں کو بھی دکھلا دے
 بھٹکے ہوئے آہو کو، پھر سوئے مرم لے چل اس شہر کے نوکر کو، پھر وسعتِ صحرا دے
 پیدا دلِ دیوانِ میں، پھر شورشِ محشر کر اس محفلِ خالی کو، پھر شاہدِ لیلا دے
 اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشاں کو وہ داغِ محبت دے، جو چاند کو شرم دے
 رفعت میں مقاصد کو ہر دوشِ ثمرِ پاکر خود داریِ ساحل دے، آزادیِ دریا دے
 بے لوث محبت ہو، بیباک صداقت ہو سینوں میں اُجالا کر، دلِ صورتِ بینا دے
 احساسِ عنایت کر آثارِ مصیبت کا مرد کی شورشِ میں اندیشہٴ فردا دے

میں بلبلیِ نالایاں ہوں ایک اُجڑے گلستاں کا

تاثر کا سائل ہوں، محتاج کو داتا دے

عید پر شہرِ لکھنؤ کی فرمائش کے جواب میں

یہ شالامار میں اک برگِ زرد کھتا تھا گیادہ دسم گلی جس کا راز دار ہوں میں
 نہ پائمال کریں مجھ کو زائرانِ چین انھیں کی شاخِ لثیم کی یادگار ہوں میں
 ذرا سے پتے نے بیتاب کر دیا دل کو چمن میں آکے سراپا غم بہار ہوں میں

خزاں میں مجھ کو رلاتی ہے یادِ فصلِ بہار خوشی ہو عید کی کیونکر کہ سو گوار ہوں میں !
 اُجاڑ ہو گئے عہدِ کہن کے مے خانے گزشتہ بادہ پرستوں کی یادگار ہوں میں

پیامِ عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے !

ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے !

فاطمہ بنتِ عبد اللہ

عرب لڑکی جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی

۱۹۱۲ء

فاطمہ ! تو آبرو دے امتِ مرحوم ہے ذرہ ذرہ تیری مشیتِ خاک کا معصوم ہے
 یہ سعادت جو صحرائی تری قسمت میں تھی غازیانِ دین کی سقائی تری قسمت میں تھی
 یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر ! ہے جسارتِ آفریں شوقِ شہادت کس قدر !
 یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی ! ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی !

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں

بجلیاں برسے ہوئے بادل میں کبھی خوابیدہ ہیں !

فاطمہ ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے نغمہ عشرت کبھی اپنے نالہ مانم میں ہے
 زمیں تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے ! ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے
 ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں
 بے خبر ہوں مگر چہ ان کی وسعتِ مقصد سے میں آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس رقد سے میں

تازہ انجم کا فضلے آسماں میں ہے ظہور
دیدہ انسان سے ناخرم ہے جن کی موج نور
جو ابھی ابھرے میں ظلمت خانہ ایام سے
جن کی ضو نا آشنا ہے قید صبح و شام سے
جن کی تابانی میں انداز کہن بھی، تو بھی ہے
اور تیرے کو کب تقدیر کا پر تو بھی ہے

شبِ نیم اور ستارے

اک رات یہ کہنے لگے شبِ نیم سے ستارے
کیا جانے تو کتنے جہاں دیکھ چکی ہے!
نہرو نے سنی ہے یہ خبر ایک ملک سے
ہر صبح نئے تجھ کو میسر ہیں نظارے
کہہ ہم سے بھی اس کشورِ دل کش کا فسانہ
جو بن کے مٹے ان کے نشان دیکھ چکی ہے
گاتا ہے قمر جس کی محبت کا ترانہ
انسانوں کی بستی ہے بہت دور فلک سے

اے تارو! نہ پوچھو چمنستانِ جہاں کی
آتی ہے صبا داں سے پلٹ جانے کی خاطر
کیا تم سے کہوں کیا چمن افروز کلی ہے
گلِ نادرِ بلبلی کی صدا سن نہیں سکتا
ہیں مرغِ نواریز گرفتارِ غضب ہے
آگتے ہیں تہ سایہ گلِ خارِ غضب ہے!
رہتی ہے سدا نرگسِ بیمار کی تر آنکھ
دل سوختہ گرمی فریاد ہے شمشاد
دل طالبِ نظارہ ہے، محرومِ نظر آنکھ
گلشن نہیں، اک بستی ہے وہ آہ و فغاں کی
بیجاری کلی کھلتی ہے مرجھانے کی خاطر
دامن سے مرے مونیوں کو چن نہیں سکتا
زندانی ہے اور نام کو آزاد ہے شمشاد

تارے شرر آہ ہیں انساں کی زباں میں میں گریہ گردوں ہوں گلستان کی زباں میں
نادانی ہے یہ گردِ زمیں طوبیٰ قمر کا سمجھا ہے کہ درماں ہے دہاں داغِ جگر کا

بنیاد ہے کا شانہٗ عالم کی ہوا پر!
فریاد کی تصویر ہے قرطاسِ فضا پر!

محاصرہ ادرہ

یورپ میں جس گھڑی حق و باطل کی چھڑ گئی حق خنجر آزمائی پہ مجبور ہو گیا
گر دِ صلیب، گر دِ قمر حلقہ زن ہوئی شکرتی حصارِ درہ میں محصور ہو گیا
مسلم سپاہیوں کے ذخیے ہوئے تمام روئے امید آنکھ سے مستور ہو گیا
آخر امیرِ عسکرے ترکی کے حکم سے ”آئین جنگ“ شہر کا دستور ہو گیا
ہر شے ہوئی ذخیرہ لشکر میں منتقل شاہیں گدے دانہٗ عصفور ہو گیا
لیکن فقیہہ شہر نے جس دم سنی یہ بات گرمہ کے مشلِ صاعقہ طور ہو گیا
”ذبحی کا مال لشکرِ مسلم پہ ہے حرام“ فتویٰ تمام شہر میں مشہور ہو گیا

چھوٹی نہ تھی یہود و نصاریٰ کا مال فوج
مسلم خدا کے حکم سے مجبور ہو گیا



غلام قادر رہیلہ

رہیلہ کس قدر ظالم، جفا جو، کینہ پرور تھا
 نکالیں شاہ تیموری کی آنکھیں نوکِ خنجر سے
 دیا اہلِ حرم کو رقص کا فرماں ستم کرنے
 یہ اندازِ ستم کچھ کم نہ تھا آثارِ محنت سے
 بھلا تمہیں اس فرمانِ غیرت کش کی ممکن تھی
 شہنشاہی حرم کی ناز نیناں سمن بر سے
 بنایا آہ! سامانِ طرب بیدرد نے ان کو
 نہاں تھا جس جن کا چشمِ مہر دامہِ داخل سے
 لڑتے تھے دلِ نازک، قدمِ مجبورِ جنبش تھے
 رداں دریائے نوحِ شہزادیوں کے دیدہ تر سے
 یو نہیں کچھ دیر تک محوِ نظر آنکھیں رہیں اس کی
 کیا گھبرا کے پھر آزاد سر کو بارِ مغضرب سے
 کمر سے اٹھ کے تیغِ جانستاں آتشِ فشاں کھولی
 سبق آموزِ تابانی ہوں اکھ جس کے جوہر سے
 رکھا خنجر کو آگے، ادر پھر کچھ سوچ کر لیٹا
 تقاضا کر رہی تھی نیند گویا چشمِ احمر سے

بجھائے خواب کے پانی نے اُنکراس کی آنکھوں کے
 نظر شرما گئی ظالم کی درد انگیز منظر سے!
 پھر اٹھا اور تیموری حرم سے یوں لگا کہنے
 شکایت چاہیے تم کو نہ کچھ اپنے مقدر سے
 مرا مندر پہ سو جانا بناوٹ تھی، ترکلف تھا
 کہ غفلت دور ہے شانِ صف آریاں لشکر سے
 یہ مقصد تھا مرا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی
 مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے
 مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
 ہیئت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

ایک مکالمہ

پر دلا اگر تو ہے، تو کیا میں نہیں پر دار؟ آزاد اگر تو ہے، نہیں میں بھی گرفتار کیوں رہتے ہیں مرغانِ ہوا مائلِ پناہ! یوں کہنے لگا سن کے یہ گفتارِ دلِ آزاد حد پہ تری پر داز کی لیکن، دیوار تو خاکِ لُشبین، انعبس گردوں سے سرد کار	اک مرغِ سرانے یہ کہا مرغِ ہوا سے گر تو ہے ہوا گیر، تو ہوں میں بھی ہوا گیر پر دازِ خصوصیتِ ہر صاحبِ پر ہے مجردِ ہیئت جو ہوئی مرغِ ہوا کی کچھ شک نہیں پر داز میں آزاد ہے تو بھی واقف نہیں تو ہیئتِ مرغانِ ہوا سے
--	---

تو مرغِ سرائی، خورش از خاک بجوئی
مادرِ صددِ دانہ بہ انجمِ زدہ منقار

میں اور تو

مذاقِ دید سے نا آشنا نظر ہے مری
تیری نگاہ ہے فطرت کی راز داں، پھر کیا؟
رہیں شکوہِ ایام ہے زباں مری
تیری مراد پہ ہے دورِ آسماں، پھر کیا؟
رکھا مجھے چمنِ آوارہ مثلِ درجِ نسیم
عطا فداک نے کیا تجھ کو آشیاں، پھر کیا؟
فرد ہے سود سے سرمایہٴ حیاتِ ترا
مرے نصیب میں ہے کاوشِ زباں، پھر کیا؟
خوا میں تیرے پھرتے ہیں تیرے طبیب
مرا جہاز ہے محرومِ بادِ باں، پھر کیا؟

قوی شدیم، چہ شد؟ ناتواں شدیم، چہ شد؟
چنبی شدیم، چہ شد؟ یا چنباں شدیم، چہ شد؟
بہیج گو نہ دریں گلستاں قرارے نیست!
تو گھر بہارِ شدی، ما خزاں شدیم، چہ شد؟

تضمین پر شعرِ الو طالبِ کلیم

غیب ہے تجھ کو شعائرِ صاحبِ ثرب کا پاس
کہہ رہی ہے زندگی تیری کہ تو مسلم نہیں
جس سے تیرے حلقہٴ خاتم میں گردوں تھا امیر
اے سلیمان! تیری غفلت نے گنوا یادہ نکلیں!
وہ نشانِ سجدہ جو روشن تھا کوکب کی طرح
ہو گئی ہے اس سے اب نا آشنا تیری جبیں!

دیکھ تو اپنا عمل، تجھ کو نظر آتی ہے کیا وہ صداقت جس کی میاں کی تھی حیرت آفریں
 تیرے آبا کی نگہ بجلی تھی جس کے واسطے ہے وہی باطل ترے کاشانہ دل میں مکیں
 غافل! اپنے اشیاء کو آکے پھر آباد کر ”
 ”سرکشی باہر کہ کردی رام او باید شدن
 شعله ساں از ہر کجا بر خاستی آنجا نشیں“

شبلی و حالی

مسلم سے ایک روز یہ اقبال نے کہا
 تیرے سرورِ رفتہ کے نغمے علوم نو
 پتھر ہے اس کے واسطے موجِ نسیم بھی
 مردانِ کارِ ڈھونڈ کے اسبابِ حادثات
 پوچھ ان سے جو چین کے ہیں دیرینہ رازدار
 مسلم مرے کلام سے بے تاب ہو گیا
 کہنے لگا کہ دیکھ تو کیفیتِ خزاں
 خاموش ہو گئے چمنستان کے رازدار
 شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہل گلستان
 دیوانِ جزوِ دکل میں ہے تیرا وجود فرد
 تہذیبِ تیرے قافلہ ہائے کہن کی گرد
 نازک بہت ہے آئینہ آبرو دے مرد
 کہتے ہیں چارہ ستم چرخِ لا جو رد
 کیونکر ہوئی خزاں ترے گلشن سے ہم برد
 غماز ہو گئی غمِ پنہاں کی آہِ سرد
 ادراق ہو گئے شجرِ زندگی کے زرد
 سرایہ گداز تھی جن کی نوائے درد
 حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نور د

”اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
 بلبل چہ گفت دگل چہ شنید و صبا چہ کرد“

ارتقا

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
جیات شعلہ مزاج وغیور و شور انگیز
سکوتِ شام سے تا نغمہٴ سحر گاہی
کشاکشِ زم و گدما، تپ و تراش و تراش
مقامِ بست و شکست و فشار و سوز و کشید
اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام
چراغِ مصطفویٰ سے شرارِ بولہبی
سرشتِ اس کی ہے مشکل کشی، جفا طلبی
ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی
ز خاکِ تیرہ دروں تا بہ شیشہٴ طہی
میانِ قطرہٴ فیضان و آتشِ عینی
یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی

”مغاں کہ دانہٴ انگور آبِ می سازند

ستارہٴ می شکنند آفتابِ می سازند“

صدیقِ رضی

اک دن رسولِ پاکؐ نے اصحابؓ سے کہا
ارشادِ سن کے، فرطِ طرب سے غمراٹھے
دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدیقؓ سے ضرور
لائے عرض کہ مالِ رسولؐ امیں کے پاس
پوچھا حضورِ سرورِ عالمؐ نے اے غمراٹھا
رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا؟
دیں مالِ راہِ حق میں جو ہوں تم میں مالدار
اس روزِ ان کے پاس تھے دیرِ ہم کئی ہزار
بڑھ کر رکھے کا آج قدم میرا ہوار
ایشان کی ہے دستِ نگر، ابتداء کے کار
اے وہ کہ خوشِ حق سے ترے دل کو ہے قرار
مسلم ہے اپنے خویش و اقارب کا حق گزار

کی غرض نصف مال ہے فرزند وزن کا حق

باقی جو ہے وہ ملت بیضا پہ ہے نثار

اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آگیا
جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار
لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ دفا سرشت
ہر چیز جس سے چشمِ جہاں میں ہوا اعتبار
ملکِ یمن درہم دینار و رخت و جنس
اسپِ قرسم و شتر و قاطر و حمار
بولے حضورِ چاہیے فکرِ عیال بھی
کہنے لگا وہ عشق و محبت کا رازدار
اے تجھ سے دیدہ نہ داغِ فروغِ گیر
اے تیری ذات باعثِ تکریمِ روزگار

پردانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس

صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس!

تہذیبِ حاضر

تضمین بر شعر فیضی

حرارت ہے ہلاکی بادِ تہذیبِ حاضر میں
بھڑک اٹھا بھڑک اٹھا بھڑک اٹھا
کیا ذرہ کو جگنو دے کے نابِ ستار اس نے
کوئی دیکھے تو شوخی آفتابِ جلوہ فرما کی
نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے
یہ رعنائی، یہ بیداری، یہ آزادی، یہ بیباکی
تغیر آگیا ایسا تدبیر میں، تخیل میں
کیا گم تازہ پروانوں نے اپنا آشیان لیکن
حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لڑتیں کیا کیا
مناسبت، رقابت، خود فرشی، ناشکیبائی، ہوسناکی
ہنسی سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگر چاکی

فروغِ شمعِ نوسے بزمِ مسلم جگمگا اٹھی مگر کہتی ہے پروانوں سے میری کہنہ ادا کی

”تو اے پروانہ! این گرمیِ شمعِ محفلے داری
چو من در آتش خود سوزا اگر سوزِ دلے داری“

والدہ مرحومہ کی یاد میں

ذرہ ذرہ دہر کا زندانیِ تقدیر ہے
پردہٗ مجبوری و بیچارگیِ تدبیر ہے
آسماں مجبور ہے، شمس و قمر مجبور ہیں
انجمِ سیما بپا رفتار پر مجبور ہیں
ہے شکستِ انجامِ غنچے کا سبو گلزار میں
سبزہ و گل بھی ہیں مجبورِ نمو گلزار میں

نغمہٗ بلبل ہو یا آوازِ خاموشیِ ضمیر
ہے اسی زنجیرِ عالم گیر میں ہر شے اسیر!

آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سترِ مجبوری عیاں
خشک ہو جاتا ہے دل میں اشکِ سیلِ رداں
قلبِ انسانی میں قصِ عیش و غم رہتا نہیں
نغمہ رہ جاتا ہے، لطفِ زیر و بم رہتا نہیں
علم و حکمت رہنِ سامانِ اشکِ دآہ ہے
یعنی اک الماس کا ٹکڑا دلِ آگاہ ہے!

گرچہ میرے باغ میں شبنم کی شادابی نہیں
 آنکھ میری مایہ دار اشکِ عنابی نہیں
 جانتا ہوں آہ! میں آلام انسانی کا راز
 ہے نوائے شکوہ سے خالی نری فطرت کا ساز
 میرے لب پر قصۂ نیرنگی، دوراں نہیں
 دل مرا حیراں نہیں، خنداں نہیں، گریاں نہیں
 پر تری تصویرِ قاصدِ گریہ بیہم کی ہے
 آہ! یہ تردیدِ میری حکمتِ محکم کی ہے
 گریہ سرشار سے بنیادِ جاں پایندہ ہے
 درد کے عرفاں سے عقلِ سنگدل شرمندہ ہے
 موجِ دردِ آہ سے آئینہ ہے روشنِ مرا
 گنجِ آبِ آدرد سے معمور ہے دامنِ مرا
 حیرتی ہوں میں تری تصویر کے اعجاز کا
 رخ بدل ڈالا ہے جس نے دقت کی پرواز کا
 رفتہ دحاضر کو گویا پاپا اس نے کیا
 عہدِ طفلی سے مجھے پھر آشنا اس نے کیا
 جب ترے دامن میں ملتی تھی وہ جانِ ناتواں
 بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں
 اور اب چرچے ہیں جس کی شوخیِ گفتار کے
 بے بہا موتی ہیں جس کی چشمِ گوہر بار کے

علم کی سنجیدہ گفتاری، بڑھاپے کا شعور
 دنیوی اعزاز کی شوکت، جوانی کا غرور
 زندگی کی ادج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم
 صحبتِ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم
 بے تکلف خندہ زن ہیں، فکر سے آزاد ہیں
 پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں
 کس کو اب ہوگا وطن میں آہ! میرا انتظار؟
 کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار؟
 خاکِ مرقد پر تیری لے کر یہ فریاد آؤں گا
 اب دعلیٰ نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا؟
 تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
 گھر مرے اجداد کا سرمایہ عزت ہوا
 دفترِ ہستی میں تھی زریں درق تیری حیات
 تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
 عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
 میں تیری خدمت کے قابل جب ہوا، تو چل بسی
 وہ جوان، قامت میں ہے جو صورتِ سرور بلند
 تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند
 کار و بارِ زندگی میں وہ ہم پہلو مرا
 وہ محبت میں تیری تصویر، وہ بازو مرا

تجھ کو مثل طفلِ کبے دستِ دِوارِ فنا ہے وہ
 صبر سے نا آشنا صبحِ دُساؤں تل ہے وہ
 تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بڑھ گئی
 شکرِ کتِ غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

آہ! یہ دنیا، یہ ماتم خانہ برنا دینا!!

آدمی ہے کس طلسمِ دوش و فردا میں اسیر!

کتنی مشکل زندگی ہے! کس قدر آساں ہے موت!

گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ازاں ہے موت!

زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں

کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں!

کلبہٴ افلاس میں، دولت کے کاشلے میں موت!!

دشت و دریں، شہر میں گلشن ہیں، دیرانی میں موت

موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں

ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں

نے مجالِ شکوہ ہے، نے طاقتِ گفتار ہے

زندگانی کیا ہے، اک طوقِ گلو افشار ہے!

قافلے میں غیر فریادِ درا کچھ بھی نہیں

اک متاعِ دید کے سوا کچھ بھی نہیں

ختم ہو جائے گا لیکن امتحان کا دور بھی

ہیں پیرائے پردہ گردوں ابھی دور اور بھی

سینہ چاک اس گلستاں میں لالہ دگل ہیں تو کیا؟
 نالہ و فساد پر مجبور بلبل ہیں تو کیا؟
 جھاڑیاں جن کے نفس میں قید ہے آہِ خزاں
 سبز کر دے گی انھیں بادِ بہارِ جادواں
 خفتہ خاکِ پے سپر میں ہے شرار اپنا تو کیا؟
 عارضی محمل ہے یہ مشیتِ غبار اپنا تو کیا؟

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں!
 لوٹنا جس کا مقدر ہو، یہ وہ گوہر نہیں!

زندگی محبوب ایسی دیدہ قدرت میں ہے
 ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے
 موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
 عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات
 ہے اگر ارباں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
 جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں
 آہ! غافل! موت کا راز نہ ہاں کچھ اور ہے!
 نقش کی ناپائنداری سے عیاں کچھ اور ہے!
 جنتِ نظر رہے نقشِ ہوا بالائے آب
 موجِ مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے جاب
 موج کے دامن میں پھر اس کو چھپا دیتی ہے یہ!
 کتنی بیدردی سے نقشِ اپنا مٹا دیتی ہے یہ!

پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا
 توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا
 اس روش کا کیا اثر ہے ہیئت تعمیر پر؟
 یہ تو حجت ہے ہوا کی قوت تعمیر پر
 فطرت ہستی شہید آرزو رہتی نہ ہو
 خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو
 آہ! سیما پریشاں، انجم گردوں فروز
 شوخ یہ چنگاریاں، ممنون شب ہے جنگا سوز
 عقل جس سے سربرآو ہے وہ مدت ان کی ہے
 سرگزشت نوع انساں ایک ساعت ان کی ہے
 پھر یہ انساں آں سوئے افلاک ہے جس کی نظر
 قدسیوں سے کبھی مقاصد میں ہے جو پاکیزہ تر
 جو مثال شمع روشن محفل قدرت میں ہے
 آسماں اک نقطہ جس کی وسعت فطرت میں ہے
 جس کی نادانی صداقت کے لیے میناب ہے
 جس کا ناخن ساز ہستی کے لیے مضرب ہے
 شعلہ یہ کمتر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا؟
 کم بہا ہے آفتاب اپنا ستاروں سے بھی کیا؟
 تنجم گاہ کی آنکھ نیرِ خاک بھی بے خواب ہے
 کس قدر نشود نما کے واسطے بے تاب ہے

زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
 خود نمائی، خود فزائی کے لیے مجبور ہے
 سردی مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
 خاک میں دب کر بھی اپنا سوز گھوسکتا نہیں
 پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
 موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ
 ہے لمحہ اس قوتِ آشفتمند کی شیرازہ بند
 ڈالتی ہے گردنِ گردوں میں جو اپنی کمند
 موت تجریدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے

خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے!
 خوگر پر وار کو پر وار میس ڈر کچھ نہیں!
 موت اس گلشن میں جز سنجیدگی پر کچھ نہیں!

کہتے ہیں اہل جہاں در و اہل ہے لادوا
 زخمِ فرقتِ دقت کے مرہم سے پاتا ہے شفا
 دل مگر غم مرنے والوں کا جہاں آباد ہے
 حلقہ زنجیرِ صبح و شام سے آزاد ہے
 دقت کے اشوس سے تھمتا ناہ ماتم نہیں
 دقت زخمِ تیغِ فرقت کا کوئی مرہم نہیں
 سر پہ آ جاتی ہے جب کوئی مصیبت ناگہاں
 اشکِ پیہم دیدہٴ انساں سے ہوتے ہیں رواں

رہا ہو جاتا ہے دل کو نالہ و فریاد سے
 خونِ دل بہتا ہے آنکھوں کی سرشک آباد سے
 آدمی تباہ شکیبائی سے گو محروم ہے
 اس کی فطرت میں یہ اک احساسِ نامعلوم ہے

ق

جو ہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
 آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے، فنا ہوتا نہیں
 رختِ ہستی خاک، غم کی شعلہ افشانی سے ہے
 سرد یہ آگ اس لطیف احساس کے پانی سے ہر
 آہ! یہ ضبطِ فضاں غفلت کی خاموشی نہیں!
 آگہی ہے یہ دلا سائی، خاموشی نہیں!
 پردہ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح
 داغِ شب کا دامنِ آفاق سے دھوئی ہے صبح
 لالہ افسردہ کو آتشِ قبا کرتی ہے یہ
 بے زباں طاغر کو سرمستِ نوا کرتی ہے یہ
 سینہ بلبِل کے زنداں سے سرودِ آزاد ہے
 سیکڑوں لغموں سے بادِ صبح دم آباد ہے
 خفتگانِ لالہ زار کو ہمارا دردِ بار
 ہونے ہیں آخرِ عرصِ زندگی سے ہم کنار

یہ اگر آئین ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

دامِ سیمینِ تخیل ہے مرا آفاق گیر
کر لیا ہے جس سے تیری یاد کو میں نے اسیر!
یاد سے تیری دل درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبہ میں دعاؤں سے فضا معمور ہے
وہ فرّ الغن کا تسلسل نام ہے جس کا حیات
جلوہ گا ہیں اس کی ہیں لاکھوں جہان بے ثبات
مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسمِ دراہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے!
ہے وہاں بے حاصل کشتِ اہل کے واسطے
سازگار آبِ دہوا تخمِ عمل کے واسطے
نورِ فطرتِ ظلمتِ پیکر کا زندانی نہیں
تنگ ایسا حلقہٴ افکارِ انسانی نہیں
زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثل ایوانِ سحر مرقدِ فروزاں ہو ترا!
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا!

آسماں تیری لحد پر شش بہنم افیشانی کرے!

شعاع آفتاب

صبح جب میری نگہ سودائی نظارہ تھی
آسمان پر اک شعاع آفتاب آوارہ تھی
میں نے پوچھا اس کرن سے سراپا اضطراب
تیری جانِ ناشکیبا میں ہے کیسا اضطراب!
تو کوئی کچھوٹی سی بجلی ہے کہ جس کو آسمان
کر رہا ہے زمین اقوام کی خاطر جواں
بیزڑپ ہے یا ازل سے تیری خو ہے، کیا ہے یہ؟
رقص ہے؟ آوارگی ہے؟ جستجو ہے؟ کیا ہے یہ؟

”خفتہ ہنگامے ہیں میری ہستی خاموش میں
مضطرب ہر دم مری تقدیر کہتی ہے مجھے
برقِ آتشِ خونہیں فطرت میں گوناری ہول میں
سرمد بن کر چشمِ انساں میں سما جاؤں گی میں
تیرے مستوں میں کوئی جویائے ہشیاری بھی ہے؟
پرورش پائی ہے میں نے صبح کی آغوش میں
جستجو میں لذتِ تنویر رکھتی ہے مجھے
مہرِ عالم تاب کا پیغام بیداری ہوں میں
رات نے جو کچھ چھپا رکھا تھا دکھلاؤں گی میں
سونے والوں میں کسی کو ذوقِ بیداری بھی ہے“

عرفی

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تجیل نے
فضائے عشق پر تحریر کی اس نے نوا ایسی
مرے دل نے یہ اک دن اسکی تربتِ شکایت کی
مزاجِ اہلِ عالم میں تغیر آگیا ایسا
فغانِ نیم شب شاعر کی بارگوش ہوتی ہے
تصدق جس پہ حیرت خانہ سینا و فارابی
میں جس سے ہیں آنکھوں کو ابتلا شکِ عنابی
تہیں ہنگامہ عالم میں اب سامانِ میتابی
کہ رخصت ہو گئی دنیا سے کیفیت وہ سیمابی
نہ ہو جب چشمِ محفلِ آشائے لطفِ یخوابی

کسی کا شعلہ فریاد ہو ظلمت رہا کیونکر؟ گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی
صدائے تبت سے آئی "شکوہ اہل جہاں کم گو نوا تلخ ترمی زن چو ذوقِ غمہ کم یابی
حدِ کراتیز ترمی خواں چو محمل را گراں مینی"

ایک خط کے جواب میں

ہوں بھی ہو تو نہیں مجھ میں سمتِ ننگِ تناز حصولِ جاہ ہے والبتہ مذاقِ تلاش
ہزار شکریہ طبعیت ہے ربزہ کار مری ہزار شکریہ نہیں ہے دماغِ فتنہ تراش
مرے سخن سے دلوں کی ہیں کیتیاں سرسبز جہاں میں ہوں میں مثالی سوابِ دریا پاش
یہ عقدِ ہلے سیاست تجھے مبارک ہوں کہ فیضِ عشق سے ناخن مر ہے سینہ خراش
ہو اے بزمِ سلاطین، دلیلِ مردہ دلی کیا ہے حافظِ رنگیں نوانے رازیہ فاش
"اگر تہو است کہ باخضر ہم نشین باشی
نہاں ز چشمِ سکندر چو آبِ حیاں باش"

نانا

قوم نے پیغامِ گوتم کی دوا پر دانہ کی قدر پہچانی نہ اپنے گوہر ایک دانہ کی!
آہ! بد قسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
آتشِ کلاں نے کیا جو زندگی کا راز نکھڑا ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز نکھا

شمعِ حق سے جو متور ہو یہ وہ محفلِ دہشتی بارشِ رحمت ہوئی، لیکن زمیں قابل نہ تھی
 آہ! شودر کے لیے ہندوستانِ غم فانی ہے دردِ انسانی سے اس سبتی کا دل بیگانہ ہے
 برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں
 بتکدہ پھر بعدِ مات کے مگر روشن ہوا نورِ ابراہیم سے آزر کا گھر روشن ہوا

پھر اٹھی آخر صدِ توحید کی پنجاب سے
 ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے!

کفر و اسلام تضمین بر شعر میر تقی دانش

ایک دن اقبال نے پوچھا کلیم طور سے اے کتیرے نقشِ پاسے دادی سینا چمن!
 آتشِ نمرود ہے اب تک جہاں میں شعلہ ریزہ ہو گیا آنکھوں سے پنہاں کیوں تو سوزِ کھن؟
 تمنا جواب صاحبِ سینا کہ مسلم ہے اگر چھوڑ کر غائب کو تو حاضر کا شیدائی نہ بن
 ذوقِ حاضر ہے تو پھر لازم ہے ایمانِ فلیل ورنہ خاکِ تر ہے تیری زندگی کا پیر ہن
 ہے اگر دیوانہ غائب تو کچھ پر دانہ کھر منتظر رہ دادی فالان میں ہو کر خیمہ زن
 عارضی ہے شانِ حاضرِ سطوتِ غائبِ مدام اس صداقت کو محبت سے ہے ربطِ جان و دن
 شعلہ نمرود ہے روشن زمانے میں تو کیا "شمعِ خود را می گدازد در میانِ انجمن"
 نورِ ماچوں آتشِ سنگ از نظر پنہاں خوش است

بلالؓ

لکھا ہے ایک مغربی حق شناس نے
 اہل قلم میں جس کا بہت احترام تھا
 جو لا نگہ سکندرِ رومی تھا ایشیا
 گرد در سے بھی بلند تر اس کا مقام تھا
 تاریخ کہہ رہی ہے کہ رومی کے سامنے
 دعویٰ کیا جو پورس و دارا نے خام تھا
 دنیا کے اس شہنشاہِ انجم سپاہ کو
 حیرت سے دیکھتا فلکِ نیل خام تھا
 آج ایشیا میں اس کو کوئی جانتا نہیں

تاریخ دان بھی اسے پہچانتا نہیں

لیکن بلالؓ، وہ حبشی زادہ حقیر
 فطرتِ حق جس کی نورِ نبوت سے مستنیر
 جس کا میں ازل سے ہوا سینہ بلالؓ
 محکوم اس صدا کے ہیں شاہنشاہِ فقیر
 ہوتا ہے جس سے اسود داحمر میں اختلاط
 کرتی ہے جو غریب کو ہم پہلوئے امیر
 ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز
 صدیل سے سن رہا ہے جسے گوشِ چرخِ پیر
 اقبال کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے؟
 رومی فنا ہوا، حبشی کو دوام ہے!

مسلمان اور محمدؐ علیہ السلام
 نصیبین بر شہرِ ملکِ قحطی

مرشد کی تعلیم تھی اے مسلم شوریدہ سرا
 لازم ہے رہزوں کے لیے دنیا میں سامانِ سفر

بدلی زمانے کی ہوا، ایسا تغیر آگیا
 وہ شعاع روشن تر، ظلمت گریزاں جس سے نفی
 شیدائی غائب نہ رہ، دیوانہ موجود ہو
 ممکن نہیں اس باغ میں کوشش ہو بار آور تری
 اس دور میں تعلیم ہے امراض ملت کی دوا
 رہبر کے ایما سے ہوا تعلیم کا سودا مجھے
 لیکن نگاہ نکتہ میں دیکھے زبوں بختی مری
 یک لحظہ غافل گشتم دس سالہ راہم دور شدہ

تھے جو گراں قیمت کبھی، اب ہیں متاع کس مخز
 گھٹ کر ہوا مثل شرف تارے سے بھی کم نور تر
 غالب ہے اب اقوام پر معبود حاضر کا اثر
 فرسودہ ہے پچھلا تر، زیرک ہے مرغ تیز تر
 ہے خونِ فاسد کے لیے تعلیم مثل نیشتر
 واجب ہے صحر اگر دہر تعمیلِ فرمانِ خضر
 "رستم کہ خارا ز پاکشتم، حمل نہاں شد از نظر

پھولوں کی شہزادی

کلی سے کہہ رہی تھی ایک دن شبنم گلستاں میں
 تمہارے گلستاں کی کیفیت سر شاہ ہے ایسی
 سنا ہے کوئی شہزادی ہے حاکم اس گلستاں کی
 کبھی ساتھ اپنا اس کے آستان تک مجھ کو تو لے چل

رہی میں ایک مدت غنچہ ہائے باغِ ضواں میں
 نگہ فردوسِ دردامن ہے میری چشم حیراں میں
 کہ جسکے نقشِ پائے پھول ہوں پیدا یا باں میں
 چھپا کر اپنے دامن میں برنگِ مویج بٹولے چل

کلی بولی سریر آ رہا ہمارے ہے وہ شہزادی
 مگر فطرت تری افتندہ اور یکم کی شان اونچی
 پہنچ سکتی ہے تو لیکن ہماری شاہزادی تک

درخشاں جس کی ٹھوک سے ہوں تپتی نگیں بن کر
 نہیں ممکن تو پہنچے ہماری ہم نشیں بن کر
 کسی دکھ درد کے مارے کا اشکِ آتشیں بن کر

نظر اس کی پیامِ عید ہے اہلِ محرم کو
بنادیتی ہے گو ہر غمزدوں کے اشکِ پیہم کو

تضمین پر شعرِ صائب

کہاں اقبال تو نے آبنایا آشیاں اپنا
شرارے وادیِ یمن کے تو جوتا تو ہے لیکن
کلی زوِ نفس سے بھی وہاں گلی ہو نہیں سکتی
قیامت ہے کہ فطرت سو گئی اہلِ گلستاں کی
دلِ آگاہ جب خوابیدہ ہو جلتے ہیں سینوں میں
نہیں ضبطِ نوا ممکن نوا جا اس گلستاں سے
نوا اس باغ میں بلبل کو ہے سامانِ رسوائی!
نہیں ممکن کہ پھوٹے اس زمیں سے تخمِ سینائی!
جہاں ہر شے ہو محرمِ تقاضے خود افزائی
نہ ہے بیدار دلِ پیری، نہ ہمت خواہ برنائی
نوا اگر کے لیے زہراب ہوتی ہے شکرِ خائی
کہ اس محفل سے خوشتر ہے کسی صحرایِ تنہائی

”ہماں بہتر کہ لیلیٰ در بیاباں جلوہ گر باشد
ندارد تنگنائے شہرِ تابِ حسنِ صحرائی!“

فردوس میں ایک مکالمہ

ہاتھ نے کہا مجھ سے کہ فردوس میں اک روز
اے آنکہ ز نورِ گہرِ نظمِ فلک تاب
حالی سے مخاطب ہوئے یوں سعدی شیراز
دامن بہ چراغِ مہِ داختر زدہ باز!
داماندہ منزل ہے کہ صرفِ تنگ دناز
کچھ کیفیتِ مسلمِ ہندی تو بیاں کر

مذہب کی حرارت بھی ہے کچھ اسکی رگوں میں
 باتوں سے ہوا شیخ کی حسائی متاثر
 جب پیرِ فلک نے ورقِ آیام کا الٹا
 آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تنزل
 دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
 مذہب سے ہم آہنگی افراد ہے باقی
 بنیاد لرز جائے جو دیوارِ چمن کی
 پانی نہ ملازمِ ملت سے جو اس کو
 یہ ذکر حضورِ شہِ شریعت میں نہ کرنا
 تھی جس کی فلک سوز کبھی گرنی آواز؟
 رور و کے لگا کھنکھانے کے اے صاحبِ اعجاز!
 آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز!
 دنیا تو ملی، طاہر دیں کر گیا پردار
 فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر، زمیں تاز
 دیں زخم ہے، جمعیتِ ملت ہے اگر ساز
 ظاہر ہے کہ انجامِ گلستاں کل ہے آغاز
 پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز
 سمجھیں نہ کہیں ہند کے مسلم مجھے غماز

خرمانتواں یافت ازاں خاک کہ کشتیم
 دیبانتواں یافت ازاں پشتم کہ رشتیم (سدری)

مذہب

تضمین بر شعر میرزا بیدل

تعلیم پیرِ فلسفہ مغربی ہے یہ
 پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا
 محسوس پر بنا ہے علومِ جدید کی
 مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام
 ناداں ہیں جن کو ہستی غائب کی ہے تلاش
 ہے شیخ بھی مثالِ برہمن صنم تراش
 اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش
 ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش

کہتا مگر ہے فلسفہ زندگی کچھ اور مجھ پر کیا یہ مرشدِ کامل نے رائے افش
 ”باہر کمال اندکے آشفگی خوش است
 ہر چند عقل کل شد بے جنوں مباش“

جنگِ پرموک کا ایک واقعہ

صفتِ بشتہ تھے عرب کے جو انانِ تیغ بند
 ایک نوجوان صورتِ سیما بمنتظرب
 اے بوعبیدہ رخصتِ پیکار دے مجھے
 بیتاب ہو رہا ہوں فراقِ رسول میں
 جاتا ہوں میں حضورِ رسالتِ پناہ میں
 یہ ذوقِ دشوق دیکھ کے کرم ہوئی وہ آنکھ
 بولا امیرِ فوج کہ ”وہ نوجوان ہے تو
 پوری کمرے خدا کے محمدِ تری مراد
 پہنچے جو بارگاہِ رسولِ امیں میں تو
 کتنی منتظرِ حنا کی غردِ سرِ زمینِ شام
 آکر ہوا امیرِ عسا کر سے ہم کلام
 لبریز ہو گیا سرے صبر و سکون کا جام
 اک دم کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام
 لے جاؤں گا نوشی سے اگر ہو کوئی پیام
 جس کی نگاہ تھی صفتِ تیغ بے نیام
 پیروں پہ تیرے عشق کا واجب ہے احترام
 کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام!
 کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام

ہم پر کرم کیا ہے خدا کے غیور نے
 پورے ہوئے جو وعدے کیے تھے حضور نے!

مذہب

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
 خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
 ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
 قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
 دامنِ دین ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
 اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی!

پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ
 ہے لازمِ دالِ عہدِ خزاں اس کے واسطے
 ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دور
 جو نغمہ زن تھے خلوتِ ادراقی میں طیور
 شاخِ بریدہ سے سبقِ اندوز ہو کہ تو
 نا آشنا ہے قاعدہ روزگار سے
 ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
 پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ!

شب معراج

آخر شام کی آتی ہے فلک سے آواز
سجدہ کرتی ہے سحر جس کو وہ ہے آج کی رات
رویک گام ہے ہمت کے لیے عرش بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

پھول

تجھے کیوں فکر ہے اے گل! دل صد چاک بلبلی کی
تو اپنے پیر میں کے چاک تو پہلے رفو کر لے!
تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی فکر لے!
صنوبر باغ میں آزاد کھی ہے، پائیکل بھی ہے
انھیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے!
تذک بخشی کو استغنا سے پیغام خیالت دے
نہ رہ منت کش شبنم، نگوں جام دسبو کر لے!
نہیں یہ شانِ خود داری، چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے، کوئی زریب گلو کر لے!

چمن میں غنچہ گل سے یہ کہہ کر اڑ گئی شبنم
 مذاقِ جو رنگ گل چیں ہو، تو پیدارنگ و بو کرے !
 اگر منظور ہو تجھ کو خزاں نا آشنا رہنا
 جہانِ رنگ و بو سے پہلے قطعِ آرزو کرے !
 اسی میں دیکھ ! مضمحل کمالِ زندگی تیرا
 جو تجھ کو زینتِ دامن کوئی آئینہ رد کرے !

شیکسپیر

شفیق صبح کو دریا کا خرام آئینہ نغمہ شام کو خاموشی شام آئینہ
 برگ گل آئینہ عارضِ زیبائے بہار شاہدِ مے کے لیے جملہ جام آئینہ
 حسن آئینہ حق اور دل آئینہ حسن دلِ انسان کو ترا حسنِ کلام آئینہ
 ہے ترے فکرِ فلک رس سے کمالِ ہستی
 کیا تری فطرتِ روشن تھی مآلِ ہستی؟
 تجھ کو جب دیدہ دیدار طلب نے ڈھونڈا تابِ خورشید میں خورشید کو پہنا دیکھا
 چشمِ عالم سے تو ہستی رہی مستور تری اور عالم کو تری آنکھ نے عیاں دیکھا
 حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
 راز داں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

میں اور تو

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
 میں ہلاکِ جادوئے سامری، تو قلیلِ شیوہ آزاری
 میں نوائے سوختہ درگلو، تو پریدہ رنگ، امیدہ بو
 میں حکایتِ غم آرزو، تو حدیثِ ماتمِ دلبری
 مرا عیشِ غم، مرا شہدِ سم، مری بود ہم نفسِ عدم
 ترا دلِ حرم، گرو عجم، ترا دیں خریدہ کافری !
 دمِ زندگی رمِ زندگی، غمِ زندگی سمِ زندگی
 غمِ رم نہ کہ سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری !
 تری خاک میں ہے اگر شر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
 کہ جہاں میں نانِ شعیر بر ہے ملا رِقوتِ جبرری !
 کوئی ایسی طرِ طواف تو مجھے اے چراغِ حرم بتا
 کہ ترے پتنگ کو پھر عطا ہو دہی سرشتِ سمندری !
 گلہ جفائے دانا کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے
 کسی تکدے میں بیاں کر دوں تو کہے صنم بھی "ہری ہری"
 نہ ستینرہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
 دہی فطرتِ اسدِ الہی، دہی مرجی، دہی غمتری

کرم لے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغ سکندری

اسیری

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند قطرہ نیساں ہے زندانِ صدقہ ارجمند
مشکب از فر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے مشکب بن جاتی ہے ہو کر نافہ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دامِ قفسِ شہرہ مند
”شہرِ زراغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند“

در یوزہ خلافت

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے چلے تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟ خلافت کی کرنے لگا تو گدائی!
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے مسلمان کو ہے ننگ وہ پادشائی!
”مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگران خواستن مویائی“

ہمایوں

(مسٹر جسٹس شاہ دین مرحوم)

اے ہمایوں زندگی تیری سراپا سوز تھی تیری چنگاری چہ راغِ انجمن افروز تھی!
 گرچہ تھا تیرا تنِ خاکی نزار و دردمند تھی ستارے کی طرح روشن نری طبع بلند
 کس قدر بیباک دل اس ناتواں پیکر میں تھا شعلہ گردوں نورِ داکِ شبتِ خاکِ تر میں تھا!
 موت کی لیکن دلِ دانا کو کچھ پروا نہیں شب کی خاموشی میں جہنمِ ہنگامہ فردا نہیں!

موت کو سمجھے ہیں غافلِ اختتامِ زندگی
 ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی!

خضرِ راہ

شاعر

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر
 گوشہٴ دل میں چھپا ہے اک جہانِ اضطراب
 شبِ سکوتِ انرا، ہوا آسودہ، دریا نہمِ میر
 تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا نصیبِ آہ!

جیسے گھوڑے میں سو جاتا ہے طفل شیر خوار
 موج مضطر تھی کہیں گھر ایوں میں مست خواب!
 رات کے افسوں سے طائر آشیاں میں اسیر
 انجم کم ضو گرفتار طلسم ماہتاب!
 دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیک جہاں پیا خضر
 جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب
 کہہ رہا ہے تجھ سے اے جو یائے اسرار ازل
 چشم دل داہو تو ہے تقدیر عالم بے حجاب!
 دل میں یہ سنکر بپا، ہنگامِ محشر ہوا
 میں شہید جستجو تھا یوں سخن گستر ہوا
 اے تری چشم جہاں میں پردہ طوفان آشکار
 جن کے ہنگامے ابھی دریا میں سوتے ہیں خموش
 ”کشتی مسکین“ ”و جان پاک“ و ”دیوار یتیم“
 علم موسیٰ ابھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش
 چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نور د
 زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش
 زندگی کاراز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟
 ادنیٰ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خردوش؟
 ہو رہا ہے ایشیا کا خرقہ دبیرینہ چاک
 نوجواں اقوام تو دولت کے ہیں پیرایہ پوش!

گرچہ اسکندر رہا محروم آپ زندگی
 فطرتِ اسکندری اب تک ہے گرم ناؤ نوش!
 بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰ
 خاکِ دھول میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش!
 آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے!
 کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے؟

جوابِ خضر

صحرا نوردی

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے؟
 یہ تنگا پوئے دامِ زندگی کی ہے دلیل
 اے رہیں خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
 گو بختی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل!
 ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پردا خرام
 وہ خضر بے برگ دساماں، وہ سفر بے سنگ میل!
 وہ نمودِ اخترِ سیماب یا ہن گامِ صبح
 یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیل!
 وہ سکوتِ شامِ صحرائیں غروبِ آفتاب
 جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں میں غلیل!

اور وہ پانی کے چشمے پر مقام کارواں
 اہل ایمان جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل!
 تازہ دیرانے کی سودے محبت کو تلاش
 اور آبادی میں تو زنجیر کی کشتِ نخل!
 پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
 ہے بھی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی!
 زندگی

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی
 ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی!
 تو اسے پیمانہٴ مرد و فردا سے نہ ناپ
 جا و داں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی!
 اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
 ستر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی!
 زندگانی کی حقیقت کو کہن کے دل سے پوچھ
 جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی!
 بندگی میں گھسٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
 اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی
 آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
 گرہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

تلفِزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ جناب
اس زریاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی
خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
بیختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زہار تو

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ فاکِ میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب
تا بدخشاں پھر دہی لعلِ گراں پیدا کرے
سوئے گردِ دلِ نالہ شبِ گیر کا بھیجے سفیر
رات کے تاروں میں اپنے راز داں پیدا کرے

یہ گھٹری محشر کی ہے تو عرصہٴ محشر میں ہے!
پیشِ گھرِ غافلِ عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!

سلطنت

آبتاؤں تجھ کو رمزِ آیہٴ اِنِّ الْمُلُوكِ
سلطنتِ اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
 پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمران کی ساحری
 جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز
 دیکھتی ہے حلقہ گردن میں سازِ دلبری
 خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں
 توڑ دیتا ہے کوئی مویشیِ طلسمِ سامری
 سروریِ زیبا فقط اس ذائقے ہمتا کو ہے
 حکمران ہے اک دہی باقی بتانِ آزاری
 از غلامیِ فطرتِ آزاد را رسوا کن
 ناتراشیِ خواجہ از برہمن کا فرتری
 ہے دہی سازِ کہنِ مغرب کا جمہوری نظام
 جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوئے قیصری
 دیوِ استبدادِ جمہوری قبا میں پائے کوب
 تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی نیلیم پری
 مجلسِ آئین و اصلاح در عیالات و حقوق
 طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثرِ خوابِ آدری!
 گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالسِ الاماں
 یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری!

اس سراپِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
 آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

سرمایہ و محنت

بندہ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
 خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیام کائنات
 اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
 شاخ آہو پر رہی صدیوں ملک تیری برات!
 دستِ دولت آفریں کو مزدیوں ملتی رہی
 اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
 ساحرِ الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
 اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات!
 نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
 ”خواجگی“ نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات
 کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے
 شکر کی لذت میں تو لٹو گیا نقدِ حیات
 مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
 انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
 مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ہمتِ عالی تو دریا بھی نہیں مہرِ قی قبول
 غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک !
 نغمہ بیدار مئی جہور ہے سامانِ عیش
 قصہ خواب آورِ اسکندر و جم کب تلک !
 آفتاب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
 آسماں ! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک !
 توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
 دوری جنت سے روئی چشمِ آدم کب تلک
 باغبانِ چارہ فراسے یہ کہتی ہے بہار
 زخمِ گل کے واسطے تدبیرِ ہم کب تلک ؟
 مکرِ ناداں طوائفِ شمع سے آزاد ہو
 اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو !

دنیا کے اسلام

کیا سنانا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
 مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز
 لے گئے تھلیٹ کے فرزند میراثِ خلیلؑ
 خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز !

ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہ لالہ رنگ !
 جو سراپا ناز تھے، ہیں آج مجبورِ نیاز !
 لے رہا ہے مے فردشانِ فرنگستاں سے پاس
 وہ مے سرکش، حرارت جس کی ہے مینا گداز
 حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
 ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
 ہو گیا مانندِ آپ ارزاں مسلمان کا لہو
 مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز
 گفتِ رومی ہر بنائے کہنہ کا یاد اداں کنند
 می ندانیِ اول آں بنیاد را دیواں کنند
 "ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں"
 حق ترا چشمے عطا کر دستِ غافل درنگر !
 مومیاں کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست
 مور بے پر ! حاجتے پیشِ سلیمانے مبر
 ربط و ضبطِ ملت، بیضی ہے مشرق کی نجات
 ایشیا دالے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
 پھر سیاست چٹوڑ کر داخل حصارِ دین میں ہو
 ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
 ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
 نیل کے ساحل سے لیکر تابجاک کا شغری !

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا

ترکِ خمر گاہی ہو یا اعرابی دالاکھر!

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی

اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاک رہ گزر!

تا خلافت کی بنادنیامیں ہو پھر استوار

لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلبِ جگر

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتار ابو بکرؓ و علیؓ ہشیار باش

عشق کو فریاد لازم تھی سودہ بھی ہو چکی

اب ذرا دل تنہا مگر فریاد کی تاثیر دیکھ!

تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج

موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

عام حریت کا جو دیکھا تھا خوابِ اسلام نے

اے مسلمان آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ!

اپنی خاکِ ستر سمندر کو ہے سامانِ وجود

مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہان پیر دیکھ!

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں

آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ!

آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردِ دل کے پاس

سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ!

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار!
ہر زمان پیش نظر لایمخلف المیخاد دار

طلوع اسلام

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افتی سے آفتاب ابھرا، گیا دورِ گراں خوانی!
عروقی مردہ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی!
مسلمان کو مسلمان کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطقِ اعرابی
اثرِ کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
"نوارِ تلخِ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی"
ترپ صحنِ چمن میں، آشیاں میں، شاخاروں میں
جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیرِ سیما بی
وہ چشمِ پاک میں کیوں زینتِ برگستواں دیکھے
نظر آتی ہے جس کو مردِ غازی کی جگر تابی!

ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کرے
چمن گے ذرے ذرے کو شہید جستجو کرے

سرساگ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گھر پیدا
کتابِ مائت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگِ دبیر پیدا
ربود آں ترک شیرازی دلِ تبریز دکا بل را
صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزارا نجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
جہا نبانی سے ہے دشوار ترکِ کار جہاں مبنی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سالِ نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ و پر پیدا
نوا پیرا ہواے بلبل کہ ہوتیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے
مسلمان سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
 یقیں پیدا کر لے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
 پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزلِ مسلمان کی
 ستارے جس کی گر دراہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
 مکاں فانی، مکیں آئی، ارل تیرا، ابد تیرا،
 خدا کا آخری پیغام ہے تو، جادواں تو ہے!
 خانبندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
 تیری نسبتِ برا، یہی ہے معارفِ جہاں تو ہے!
 تیری فطرتِ امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
 جہاں کے جو ہر مضمحل گویا امتحاں تو ہے!
 جہانِ آبِ دگل سے عالمِ جاوید کی خاطر
 نبوتِ ساتھ جس کو لے گئی، وہ ارمغاں تو ہے!
 یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضنا سے ہے پیدا
 کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسپاں تو ہے
 سبقِ پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
 لیا جائے گا تجھ سے کامِ دنیا کی امامت کا
 یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانِ
 اخت کی جہاں گیری، محبت کی فرادانی!
 بتانِ رنگِ دھون کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
 نہ تو راہی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

میان شاخساراں صحبتِ مرغِ چین کب تک
 ترے بازو میں ہے پروازِ شاہینِ قہستانی!
 گماں آباد ہستی میں یقینِ مردِ مسلمان کا
 بیاباں کی شربِ نارِ یک میں تبدیل رہبانی!
 مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
 وہ کیا تھا؟ زورِ جبر و فقرِ بوزِ صدقِ سلمانی
 ہوئے احرارِ ملتِ جادہ پیمائے کس تجل سے
 تماشائیِ شکافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی!
 ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں
 کہ المانی سے بھی پائیندہ تر نکلا ہے توراتی
 جب اس انگارہٴ خاکی میں ہوتا ہے یقین پیدا
 تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روحِ الایں پیدا
 غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں، نہ تدبیریں
 جو ہو ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
 کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا؟
 نگاہِ مردِ مؤمن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں!
 ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہاں گیری،
 یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتہٴ ایمان کی تفسیر!
 براہِیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
 ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں!

تمیز بندہ د آقا فسادِ آدمیت ہے
 حذر اے چہرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تفریریں!
 حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
 لہو خورشید کا ٹپکے انگر ذرے کا دل چیریں
 یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
 جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ پایدِ مرد را طبعِ بلندے، مشربِ نابے
 دلِ گرمے، نگاہِ پاکِ بینے، جانِ بیتابے!

عقابِ شان سے چھپے تھے جو بالِ وپر نکلے
 ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے!
 ہوئے مدفون دریا زبرِ دریا تیرنے والے
 طمانچے موج کے کھاتے تھے جو بن کر گھر نکلے!
 غبارِ رہ گزر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
 جبینِ خاک پر رکھتے تھے جو اکسیر گر نکلے!
 ہمارا نرم رو قاصدِ پیامِ زندگی لایا
 خردِ تہیِ تمھیں جن کو بجلیاں وہ پیچر نکلے!
 حرمِ رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے
 جو انانِ تنہا رہی کس قدر صفا نظر نکلے!
 زمیں سے نوریانِ آسمان پرواز کہتے تھے
 یہ خاکی زندہ تر، پایندہ تر، تابندہ تر نکلے!

جہاں میں اہل ایمان صورتِ خورشید جیتے ہیں
 ادھر ڈوبے، ادھر نکلے، ادھر ڈوبے، ادھر نکلے!
 یقیناً افراد کا سرمایہ تعمیرِ ملت ہے
 یہی قوت ہے جو صورتِ گہر تقدیرِ ملت ہے

تو از کن نکال ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
 خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجمان ہو جا
 ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
 اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
 یہ ہندو، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
 تو اے شرمندہ ساحلِ چہل کربے کراں ہو جا
 غبارِ آلودہ رنگ و نسب ہیں بالِ دہرِ تیرے
 تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا
 خودی میں ڈوب جا غافلِ یہ سترِ زندگانی ہے
 نکل کر حلقہٴ شام و سحر سے جا دداں ہو جا
 مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
 شبستانِ حجت میں حریر و پرنیاں ہو جا
 گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہِ دیباہاں سے
 گلستاں راہ میں آئے توجہ نغمہ خواں ہو جا
 ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
 نہیں ہے نجد سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہر یاری ہے
 قیامت ہے کہ انساں نورِ انساں کا شکاری ہے!
 نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
 یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے!
 وہ حکمت ناز تھا جس پر خرد منداں مغرب کو
 ہوس کے پنجہِ خوئیں میں تیغِ کار زاری ہے!
 تدبیر کی فسوں کاری سے محکم نہ نہیں سکتا
 جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
 عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
 یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
 خروشِ آموزِ بلبل ہو کر غنچے کی داگر دے
 کہ تو اس گلستاں کے واسطے بادِ بہاری ہے
 پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
 زمیں جو لانگہِ اطلس قبایاں تتاری ہے!

بیا پیدا خریدار است جانِ ناتوانے را
 ”نپس از مدت گزرا افتاد بر ما کاروانے را“

بیا ساقی نوائے مرغِ زار از شاخسار آمد
 بہار آمد نگار آمد، نگار آمد، قرار آمد!
 کشید ابر بہاری خیمہ اندر دادی و صحر
 صدائے آبشاراں از فرازِ کوہِ سار آمد!

سرت گردم تو ہم قانون پیشیں سازدہ ساقی
 کہ خیلِ نغمہ پردازاں قطاراںند قطار آمد
 کناراں زابداں برگیرد بے باکانہ ساغر کش
 پس از مدت ازین شاخِ کھن بانگِ ہزار آمد
 بہ مشتاقانِ حدیثِ خواجہ بدرِ حنین آدر
 تصرفِ ہائے پنہانش بچشمِ آشکار آمد
 دگر شاخِ خلیل از خونِ امنناک می گردد
 بہ بازارِ محبتِ نقدِ ماکامل عیار آمد
 سرِ خاکِ شہیدے بر گھائے لالہ می پاشم
 کہ خوش بانہالِ ملت ماسازگار آمد
 ”بیاتا گل بیفشائیم دمے در ساغر اندازیم
 فلک را سقف بشکافیم و طرح دیگر اندازیم“



غزلیات

اے بادِ صبا! کلی والے سے جا کہیں پیغام مرا
قبضے سے امت بیجاری کے دیں بھی گیا، دنیا بھی گئی
یہ موج پر نشاں خاطر کو پیغام لب ساحلِ نحویا
ہے دور وصالِ بحر بھی، تو دریا میں گہرا بھی گئی
عزت ہے محبت کی قائم اے قیس! حجابِ محمل سے
محمل جو گیا، عزت بھی گئی، غیرت بھی گئی، لیلہ بھی گئی
کی ترک تگ و دو قطرے، تو آبرو دے گوہر بھی ملی
آوارگیِ فطرت بھی گئی، ادر کشمکشِ دریا بھی گئی
نکلی تو لبِ اقبال سے ہے کیا جانے کس کی ہے یہ صدا!
پیغام سکوں پہنچا بھی گئی، دل محفل کا ترپا بھی گئی!

.....

یہ دردِ قمری و بلبِ فریبِ گوش ہے	باطن ہنگامہ آبادِ چین خاموش ہے
تیرے پیانوں کا ہے یہ اے مغربِ اثر	خندہ زن ساقی ہے، ساری انجمنِ ہوش ہے
دہر کے غم خانے میں تیرا پتا ملتا نہیں	جرمِ نفاقِ انفریش بھی کہ تو ردِ پوش ہے؟
آہ! دنیا دل سمجھتی ہے جسے وہ دل نہیں	پہلوئے انسان میں اک ہنگامہ خاموش ہے
زمندگی کی رہیں چل، لیکن ذرا بچ کے چل	یہ سمجھ لے کوئی مینا خانہ بارِ دردش ہے

جس کے دم سے دلی دلا ہو رہم پہلو ہوئے
آہ! اے اقبال، وہ بلبل بھی اب خاموش ہے

.....❖.....

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام اکبھی
پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
بے خطر کو دہڑا آتش نمرود میں عشق
عشق فرمودہ قاصد سبک گام عمل
شیوہ عشق ہے آزادی و دہرا شوبی
عذریہ پر ہیز پہ کہتا ہے بگڑ کر ساقی
سچی پیہم ہے تراز دے کم و کیف حیات
اے رنیاں! یہ تنک بخشی شبنم کب تک؟
بادہ گردانِ عجم وہ، عربی میری شراب
اپنے سینہ میں اسے اور ذرا تھام اکبھی
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام اکبھی
عقل ہے محو تماشائے لب بام اکبھی
عقل سمجھی ہی نہیں معنی پیغام اکبھی
تو ہے زناری بت خانہ ایام اکبھی
ہے تیرے دل میں وہی کاوش انجام اکبھی
تیری میزوں ہے شمارِ سحر و شام اکبھی
مرے کھسار کے لالے ہیں تہی جام اکبھی
مرے ساغر سے جھکتے ہیں مے آشام اکبھی

خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
تو گرفتار بھڑکتا ہے تیرے دام اکبھی

.....❖.....

پردہ چہرے سے اٹھا، انجمنِ آرائی کر
تو جو بجلی ہے تو یہ چشمک پنہاں کب تک؟
نفسِ گرم کی تاثیر ہے اعجازِ حیات
کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم!
چشمِ مہر و مہر و انجم کو تماشائی کر
بے حجابانہ مرے دل سے شناسائی کر
تیرے سینے میں اگر ہے تو مسیحائی کر
اپنی ہستی سے عیاں، شعاعِ سینائی کر

ہوتی غاک کے ہر ذرے سے تعمیرِ حرم
 اس گلستاں میں نہیں حد سے گزرنا اچھا
 دل کو بے گانہ اندازِ کلیسا کی کر
 ناز بھی کر تو باندازہٗ رعنائی کر
 پہلے خود دار تو مانندِ سکندر ہوئے
 پھر جہاں میں ہو س شوکتِ دارائی کر
 مل ہی جائے گی کبھی منزلِ یلیٰ اقبال
 کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر



پھر بادِ بہار آئی، اقبال غزلخواں ہو
 تو خاک کی مٹھی ہے، اجزا کی حرارت سے
 غنیمت ہے اگر گل ہو! گل ہے، تو گلستاں ہو
 برہم ہو، پریشاں ہو، دست میں بیاباں ہو
 کم مایہ میں سوداگر! اس دس میں ارزاں ہو
 تو نعمتِ رنگیں ہے، ہر گوش پہ عریاں ہو
 اے ہر دوزخِ زانہ، رستے میں اگر تیرے
 کیوں ساز کے پردے میں مستور ہوئے تیری
 گلشن ہے تو شبنم ہو، صحرا ہے تو طوفان ہو

ساماں کی محبت میں مضمر ہے تنِ آسانی
 مقصد ہے اگر منزل، غارت گہ ساماں ہو



کبھی اے حقیقتِ منتظر، نظرِ آلباسِ مجاز میں
 کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
 طربِ آشنائے خروش ہو، تو لوہے محرمِ گوش ہو
 وہ سرد کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردہ ساز میں
 تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے تنہا آئینہ ہے وہ آئینہ
 کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

دہم طوف کر بک شمع نے یہ کہا کہ وہ اثر کہیں
 نہ تیری حکایت سوز میں، نہ مری حدیث گداز میں
 نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
 مرے جرم خانہ خراب کو ترے غنچہ بندہ نواز میں
 نہ وہ عشق میں رہیں گے میاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
 نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلف ایاں میں
 جو میں سر بسجود ہوا کبھی تو میں سے آنے لگی صدا
 ترادلی تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا ناز میں

.....

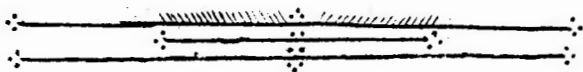
نہ دام بھی غزل آشتار ہے طائرانِ چمن تو کیا
 جو فضاں دلوں میں تڑپ رہی تھی نوائے زیر لبی رہی
 ترا جلوہ کچھ بھی تسلی دلِ نا صبور نہ کر سکا
 دہی گریہ سحری رہا، دہی آہ نیم شبی رہی
 نہ خدا رہا نہ صنم رہے، نہ رقیب دیر و حرم رہے
 نہ رہی کہیں اسد اللہی، نہ کہیں ابو لہی رہی
 مرا ساز اگر چہ ستم رسیدہ زخم ہائے عجم رہا
 وہ شہیدِ ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا میری عربی رہی

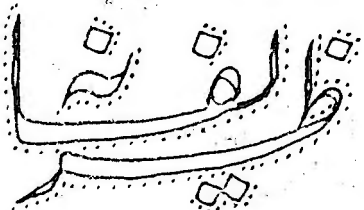
.....

گرچہ تو زندانی، اسباب ہے قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ
اسے مسماں ہر گھڑی، بیشِ نظر آیہ لَا يُخْلِفُ الْمِعَادَ رکھ

یہ "لسانِ العصر" کا پیغام ہے
"إِنِّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ يَادِرْكَه"





بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ طریقہ

مشرق میں اصول دین بن جلتے ہیں مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں
رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلے داں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں

.....
لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی ڈھونڈتی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مد نظر وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین؟ پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

.....
شیخ صاحب بھی نوپڑ کے کوئی حامی نہیں مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بظن ہو گئے
دعظ میں فرادیا کی آپ نے یہ صاف صاف "پردہ آخر کس سے ہو جب مردی زن ہو گئے

.....

یہ کوئی دن کی بات ہے، اے مردِ موہنمند! غیرت نہ تجھ میں ہوگی، نہ زنِ اداٹ چاہے گی
 آتا ہے اب وہ دور کہ اولاد کے عوض کونسل کی ممبری کے لیے دوط چاہے گی

تعلیم مغربی ہے بہت جرات آفریں پہلا سبق ہے، بیٹھ کے کالج میں مارڈینگ
 بستے ہیں ہند میں جو خریدار ہی فقط آغا بھی لے کے آتے ہیں اپنے وطن ہینگ
 میرا یہ حال، بوٹ کی ٹوچاٹنا ہوں میں ان کا یہ حکم، دیکھ! مرے فرش پر نہ رینگ
 کہنے لگے کہ اونٹ ہے بھڑا سا جانور اچھی ہے گائے، رکھتی ہے کیا نوکدار سینگ

کچھ غم نہیں جو حضرت داعظ ہیں تنگ دست تہذیبِ نو کے سامنے سراپنا خم کریں
 رجزِ جہاد میں تو بہت کچھ لکھا گیا تردیدِ حج میں کوئی رسالہ رقم کریں

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ؟ دفعِ مرض کے واسطے پل پیش کیجیے!
 تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض دل چاہتا تھا ہدیہ دل پیش کیجیے!
 بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق کہتا ہے ماسٹر سے کہ "بل پیش کیجیے!"

انتہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تلک
 چستریاں، رومال، مفلر، پیرہن جاپان سے

اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی
آئیں گے غمناک بل سے، کھن جاپان سے

.....

ہم مشرقی کے مسکینوں کا دل مغرب میں جاٹکا ہے
داں کنٹر سب بلوری ہیں یاں ایک پرانا ٹکڑا ہے
اس دور میں سب مٹ جائیں گے، ہاں باقی وہ رہ جائیگا
جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے
اے شیخ دبر مہن! سنتے ہو کیا اہل بصیرت کہتے ہیں؟
گردوں نے کتنی بلندی سے ان قوموں کو دے پڑکا ہے
یا باہم پیار کے جلسے تھے، دستورِ محبت قائم تھا
یا بحث میں اردو ہندی ہے، یا قربانی یا جھٹکا ہے

.....

”اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے“
کیوں اے جناب شیخ سنا اپنے بھی کچھ
ہم پوچھتے ہیں مسلم عاشقِ مزاج سے
غالب کا قول سچ ہے تو پھر ذکرِ غیر کیا؟
کہتے تھے کعبہ والوں سے کل اہلِ دیر کیا؟
الفت بتوں سے ہے تو برہمن سے بیکر کیا؟

.....

ہاتھوں سے اپنے دامنِ دنیا نکل گیا
قانونِ وقف کے لیے لڑتے تھے شیخ جی
رخصت ہوا دلوں سے خیالِ معاد بھی
پوچھو تو وقف کے لیے جاندا کبھی؟

.....

دہس بولی ارادہ خودی کا جب کیا میں نے
مہتاب پہ تولے عاشق باہر نہ دھڑکے
نہ جرات ہے نہ خیر ہے تو قصہ خود نشی کیسا؟
یہ مانا دردِ ناکا می گیا تیرا گزر حد سے
کہا میں نے کہ "اے جانِ جہاں کچھ نقدِ دل وادو
کرائے پر رنگا لوں گا کوئی افغان سرحد سے

ناداں تھے اس قدر کہ نہ جانی عرب کی قدر
حاصل ہوا یہی، نہ بچے مار پیٹ سے
مغرب میں ہے جہازِ بیاباں شتر کا نام
ترکوں نے کام کچھ نہ لیا اس فلیٹ سے

ہندوستان میں جزو حکومت ہیں کونسلیں
آغاز ہے ہمارے سیاسی کمال کا
ہم تو فقیر تھے ہی، ہمارا تو کام تھا
سیکھیں سلیقہ اب امر ابھی "سوال" کا

ممبری امپیریل کونسل کی کچھ مشکل نہیں
وٹ تول جائیں گے پیسے بھی دلوں گے کیا؟
میرزا غالب خدا بخشنے، بجا فرما گئے
"ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں، کھائیں گے کیا؟"

دلیل مہر و وفا اس سے بڑھ کے کیا ہوگی
نہ ہو حضور سے الفت، تو یہ ستم نہ سہیں
مصر ہے حلقہ کیٹی میں کچھ کہیں ہم بھی
مگر ضائع کلکٹر کو بھانپ لیں تو کہیں
سند تو لیجیے لڑکوں کے کام آئے گی
وہ مہربان ہیں اب پھر رہیں، رہیں نہ رہیں
زمین پر تو نہیں ہندیوں کو جالمتی
مگر جہاں میں ہیں خالی سمندر وں کی نہیں

مشال کشتی بے حس مطیع فرماں ہیں
کچھ تو بستہ ساحل رہیں، کہو تو نہیں

فرار ہے تھے شیخ طریق عمل پہ وعظ
مشرک ہیں وہ جو کہتے ہیں مشرکے لیں دین
ناپاک چیز ہوتی ہے کافر کے ہاتھ کی
اک بادہ کش بھی وعظ کی محفل میں تھا شریک
کچنے لگا ستم ہے کہ ایسے قبیوہ کی
پابند ہو تجارت سامان خورد و نوش
میں نے کہا کہ ”آپ کو مشکل نہیں کوئی
ہندوستان میں ہیں کلمہ گو بھی مے فروش“

دیکھیے چلتی ہے مشرق کی تجارت کب تک
ہے مداد لے جنوں نشتر تعلیم جدید
شیشہ دیں گے عوض جام و سبوتینا ہے
میرا سر جن رنگ ملت سے لہو لیتا ہے

گائے اک روز ہوئی اونٹ سے یوں گرم سخن
میں تو بدنام ہوئی توڑ کے رستی اپنی
ہند میں آپ تو از دے سیاست ہیں اہم
کل ملک آپ کو تھا گائے کی محفل سے حذر
آج یہ کیا ہے کہ ہم پر ہے عنایت اتنی
جب یہ تقریر سنی اونٹ نے شراب کے کہا
رشک صد غزہ اشتراہے تری ایک کلیں
ترے ہنگاموں کی تاثیر پہ کھیلی بن میں
نہیں اک حال پہ دنیا میں کسی شے کو فرار
سنی ہوں آپ نے بھی توڑ کے رکھ دی ہے مہار
ریل چلنے سے مگر دشت عرب میں بیکار
تھی لٹکتے ہوئے ہونٹوں پہ صائے زہار
نہ رہا آئینہ دل میں وہ دیرینہ غبار
ہے ترے چاہنے والوں میں ہمارا بھی شمار
ہم تو ہیں ایسی کلیوں کے پرانے بیمار
بے زبانوں میں بھی پیدا ہے ملاقی گفتار

ایک ہی بن میں ہے مدت سے بسیر اپنا
 گرچہ کچھ پاس نہیں، چارہ کبھی کھانے میں اصرار
 گوسفند و شتر و گاو پلنگ و خیر لنگ
 ایک ہی رنگ میں رنگیں ہوں تو ہے پناہ دار
 باغبان ہو سب آموں جو یک رنگی کا
 ہم زباں ہو کے رہیں کیوں نہ طیور گلزار
 دے دی جام تہیں بھی کہ مناسب ہے یہی
 تو بھی سرشار ہو، تیرے رنقا بھی سرشار
 "دلق حافظ بچہ ارزد بہ ہمیش رنگیں کن
 وانگہش مست و خراب اندرہ بازار بیار"

.....

رات چھڑنے کہہ دیا مجھ سے
 ماجرا اپنی ناتمامی کا
 مجھ کو دیتے ہیں ایک بوند لہو
 صلہ شب بھر کی تشنہ کامی کا
 اور یہ بسوہ دار بے رحمت
 پی گیا سب ہو اسامی کا

.....

یہ آیہ نوحیل سے نازل ہوئی مجھ پر
 گینا میں ہے قرآن تو قرآن میں گیتا
 کیا خوب ہوئی آشتی شیخ دبر ہمن
 اس جنگ میں آخر نہ یہ ہار نہ وہ جیتا
 مندر سے تو بزار تھا پہلے ہی سے "بدری"
 مسجد سے نکلتا نہیں، ہندی ہے "مسیتا"،

.....

جان جائے ہاتھ سے جائے نہ ست ہے یہی اک بات ہر مذہب کا تت
چٹے بٹے ایک ہی تھیلی کے ہیں سا ہو کاری، بسوہ داری، سلطنت

محنت و سرمایہ دنیا میں صف آرا ہو گئے دیکھے ہوتا ہے کس کس کی تٹاؤں کا خون
حکمت و تدبیر سے یہ فتنہ آشوب خیز ٹل نہیں سکتا "وقد کنتم بہ تستعجلون"
"کھل گئے" یا جوج اور جوج کے لشکر تمام
چشمِ مسلم دیکھے تفسیرِ حرفِ "ینسلون"

شام کی سرحد سے رخصت ہے وہ زندِ نیرل رکھ کے میخانے کے سارے قاعدے بالائے طاق
یہ اگر سچ ہے تو ہے کس درجہ عبرت کا مقام رنگ اک پل میں بدل جاتا ہے یہ نیلی رداق
حضرتِ کمرن کو اب فکرِ مداوا ہے ضرور حکمِ برداری کے محلے میں ہے دردِ لایطاق

دفعہ ہندوستان سے کہتے ہیں سر آغا خاں طلب
کیا یہ چورن ہے پے ہضمِ فلسطین و عراق؟

تکرار تھی مزارع و مالک میں ایک روز
 دو نویہ کہہ رہے تھے مرا مال ہے زمیں
 کہتا تھا وہ، کرے جو زراعت اسی کا کیفیت
 کہتا تھا یہ کہ عقل ٹھکانے تری نہیں
 پوچھا زمیں سے میں نے کہ ہے کس کا مال تو
 بولی مجھے تو ہے فقط اس بات کا یقین
 مالک ہے یا مزارع شوریدہ حال ہے
 جو زیرِ آسماں ہے وہ دھرتی کا مال ہے

.....
 اٹھا کر پھینک دو باہر لگی میں نئی تہذیب کے انڈے میں گندے
 الکشن، بھری، کونسل، صدارت بنائے خوب آزادی نے پھندے
 میاں نیجا رہی جھیلے گئے ساتھ
 نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

.....
 کارخانے کا ہے مالک مردک ناگردہ کار عیش کا پتلا ہے محنت ہے اسے ناسازگار
 حکیم حق ہے لیسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

.....

سنا ہے میں نے کل گشتگو تھی کارخانے میں پرلے جھونپڑوں میں ہے ٹھکانہ دستکاروں کا
مگر سرکار نے کیا خوب کو نسل ہال نبوایا کوئی اس شہر میں تکیہ نہ تھا سرمایہ داروں کا

.....

مسجد تو بنادی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پانی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا
کیا خوب امیر فیصل کو ستوسی نے پیغام دیا
تو نام و نسب کا حجازی ہے پر دل کا حجازی بن نہ سکا
ترا نکلیں تو ہو جاتی ہیں، پر کیا لذت اس رونے میں
جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشکِ پیازی بن نہ سکا
اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتنار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

.....

تَمَسُّ بِأَلْبَانِيَّةٍ

کتبہ:۔ لعل خجیاں



